سلسلہ مطبوعات الہ آباد لٹریری وکلچرل ایسوسی ایشن الہ آباد

گلِ نغمہ

(کلیاتِ فراق کا پہلا حصہ)

فراق گورکھپوری

ادارہ • انیس اردو • الہ آباد

باراول ۱۹۵۹ء

قیمت

۶/۸ روپے

پرنٹر عبدالمجید

اسرار کریمی پریس الہ آباد

دورِ حاضر میں نشر و اشاعت کی دشواریوں میں جس قدر اضافہ ہوا ہے
وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن نامناسب حالات کے باوجود ادارہ انیس اردو
الہ آباد نے آنے والی نسلوں کے ادبی اور علمی شعور کو مدنظر رکھتے ہوئے
پورے کھرو سے کے ساتھ تالیف و تصنیف اور اعلیٰ معیاری اور تعمیری ادب
کی نشر و اشاعت کی اہم ذمہ داری اپنے سر لی ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ
انشاءاللہ ہماری کوششیں کامیاب ہوں گی۔

ہمیں یقین ہے کہ جس حُسن نیت سے اس ادارہ نے اس سلسلے کا
آغاز کیا ہے اسی وسعتِ قلب سے ہماری ہمت افزائی کی جائے گی۔

سکریٹری نشر و اشاعت

ادارہ انیس اردو الہ آباد

فہرست

مضامین

غزلیات

نظمیں

رُباعیات

ابتدائیہ

ایک عظیم شاعر کی دور بین نگاہیں فرد اکی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہیں۔ وہ اگر چہرۂ
افکار سے پردہ اٹھا دے تو کوئی بھی اس کی نواؤں کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس کا
افق ذہنی بے حدود و بے ثغور رہتا ہے اس کی تقویم فکر میں عصر رواں کے سوا
کچھ ایسے بھی زمانے ہوتے ہیں جن کو کوئی بھی نام نہیں دیا گیا ہے۔ اس کے سامنے
وہ صبحیں بھی بے حجاب ہوتی ہیں جن کی جلوہ فرمائیاں اور تجلی ریزیاں مستقبل کی
تیرہ وتار پہنائیوں اور وسعتوں میں گم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے مطالعہ اور فکر و نظر
کا مرکز ان انسانی پہلوؤں کو قرار دیتا ہے جو ایک واحدے کی حیثیت رکھتے ہیں
وہ ایسی باتیں کہتا ہے جو زمان و مکاں کی قیود سے بے نیاز و بے فکر ہوتی ہیں
اور وہ ایسا لائحہ عمل اور دستور حیات پیش کرتا ہے جو آفاقی اور کائناتی ہو اور
جو قدر اول کے ساتھ ساتھ قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہو، ہم اسے اس کے
زمانہ سے الگ نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا عہد ہی اس کو بڑا بناتا ہے۔ عظیم
فن کار زمانہ گر اور زمانہ آفریں ہوتا ہے۔ زمانہ سے متاثر ہونے کے بھی دو پہلو

ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ خود کو ان قدروں اور اس طرزِ حیات کے سپرد کردیا جائے جو اس دور کی نمائندگی کرتے ہیں اور انھیں تسلیم کرلیا جائے دوسرے یہ کہ ان سے کوئی اتفاق نہ کیا جائے اور زندگی کے نئے اصول اور ضابطے مرتب کئے جائیں لیکن یہ بغاوت اور یہ انحراف و اجتہاد اسی صورت میں درست اور جائز سمجھا جائے گا جب واقعی وہ دور تمدنی اور تہذیبی انحطاط پر آمادہ ہو، حق و صداقت اور انسانیت دوستی سے برگشتگی نراجیت ہے اور اسے کبھی اور کسی دور میں بھی، بہ نظر تحسین نہیں دیکھا گیا، ایک بڑا شاعر یا فن کار جب تمدن کی زوال آمادگی اور انسانیت کی پستی کو دیکھتا ہے تو وہ بے باک اور بے خوف ہو کر ان کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ ایک اچھا شاعر بغاوت نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی کسب و استفادہ اور انتخاب کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا اور "خذ ما صفا، دع ما کدر" کے اصول پر عمل کرکے خاموش ہو جاتا ہے، وہ بہت ہی بے ضرر ہوتا ہے، وہ زمانے سے خوف زدہ رہتا ہے لیکن زمانہ اس سے نہیں ڈرتا، ورڈسورتھ نے ایک شاعر کے صحیح فرائض میں "زندگی کے مناظر پر مناسب جذبات کے ساتھ غور کرنا" بتایا ہے (TO CONTEMPLATE THE SPECTACLE OF LIFE WITH APPROPRIATE EMOTIONS.)

بعض اوقات اچھائی اور عظمت کی خصوصیات ایک ہی پیکرِ واحد میں جمع

ہوجاتی ہیں اور یہی خصوصیات اس شاعر یا فن کار کو حیات جاوداں بخش دیتی ہیں، اس دور کی اردو شاعری اپنے خوشگو شعرا کی تعداد اور اپنے شاعرانہ سرمائے کے اعتبار سے کسی اور زبان سے کم نہیں لیکن یہ بات یقیناً حیرتناک ہے کہ اقبالؔ کے بعد کوئی بھی غزل گو اور عظیم شاعر پیدا نہ ہوسکا، باوجود اس کے کہ اقبال کا ایک فلسفہ تھا، ان کی ایک فکر تھی اور وہ اسی فلسفہ و فکر کی اشاعت و تبلیغ کے خواہاں تھے لیکن عجیب بات ہے کہ ان کا فکر و فلسفہ ان کے فن کو ذرا بھی متاثر نہ کرسکا، وہ تلازمۂ فنی جس کی بنیاد پر رفعت و علو کا معیار متعین کیا جاتا ہے اس کا اقبال نے اپنے فلسفہ و فکر کی درشتی اور بھرپور سنجیدگی و متانت کے باوجود پورا احترام و لحاظ کیا، اقبال ان ذہنوں کے لئے بے پناہ کشش رکھتے ہیں جو پختہ ہوچکے ہیں، تلاش و جستجو کے بعد بھی ان کا مدمقابل نظر نہیں آتا۔

فراقؔ کا شمار اس دور کے ان اردو شعرا میں کیا جاتا ہے جن میں اچھائی اور عظمت کے آثار بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ فراقؔ نہ تو فلسفی و مفکر ہیں اور نہ مذہبی مبلغ اور اخلاقی مصلح، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں ایک مفکرانہ شان پائی جاتی ہے اور کشود کار کی ایک کوشش ضرور ہے لیکن ہمارے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم فراقؔ کا مطالعہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے کریں اور ان کا منصب و مرتبہ ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے متعین کریں، ان کی غزلوں اور رباعیات کا امعانِ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں بیک وقت کئی باتوں کا احساس

ہوتا ہے۔ پہلی چیز جو ہمارے دل ودماغ پر حاوی ہو جاتی ہے وہ ان کا شدید غم ہے
جس کے نتیجے میں انھیں محرومی ویاس کا سامنا کرنا پڑا۔ میر کے یہاں بھی غم تھا
اور فانی کے یہاں بھی لیکن فانی کا غم میر کے غم کی لطافت ولذت سے آشنا نہ ہو سکا
فراق کا غم اپنی انفرادیت اور اپنی تخئیل کی ندرت کے ساتھ میر کا غم لئے ہوئے ہے۔ آسکر وائلڈ
نے ایک بڑے مزے کی بات کہی ہے " خندہ ونشاط کے پیچھے ہو سکتا ہے کہ ایک
درشت، سخت گیر اور رحم نا آشنا مزاج ہو لیکن غم کے پیچھے ہمیشہ غم رہتا ہے"
یہی نہیں بلکہ اس کا قول یہ بھی ہے کہ "عیش ونشاط ایک خوبصورت جسم کے
لئے ہیں اور غم واندوہ ایک خوبصورت روح کے لئے " اور ہم نے تو یہی
دیکھا ہے: یہ ایک حقیقت ہے کہ روح کی خوبی وزیبائی میں جس قدر غم کا ہاتھ
ہوتا ہے اتنا مسرت کا نہیں، کیا میر کو پڑھنے کے بعد آپ کو ان کی روح
کی لطافت کا احساس نہیں ہوتا ؟ فراق کے غم میں ان کی روح کی لطافت جھلکتی
ہے۔ فراق کا غم زندگی سے بیزاری وفرار کی تلقین نہیں کرتا۔ فراق کی ان
غزلوں کو دیکھئے جو انھوں نے بطرز میر لکھی ہیں، آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے
گا کہ وہ میر سے اور ان کے غم کے مزاج سے کس قدر قریب ہیں، غم
کی یہی شدت اور غم کا یہی احساس فنکارانہ زندگی کا نقطۂ کمال ہے، فنکارانہ
زندگی اور کیا ہے ؟ شدید اور شعلہ آسا تخئیل (INTENSE AND-
FLAME-LIKE IMAGINATION) کے بعد صرف ایک خود ارتقائی عمل سے

ہم سے فراقؔ اکثر چھپ چھپ کر پہروں پہروں رووو ہو
وہ بھی کوئی ہمیں جیسا ہے کیا تم اس میں دیکھو ہو

جن کو اتنا یاد کرو ہو چلتے پھرتے سائے تھے
اُن کو مٹے تو مدت گزری نام و نشاں کیا پوچھو ہو

اکثر گہری سوچ میں ان کو کھویا کھویا پاویں ہیں
اب ہے فراقؔ کا کچھ روزوں سے جو عالم کیا پوچھو ہو

اپنے حواس میں شبِ غم کب حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آرہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

کچھ اور بھی تو ہو ان اشارات کے سوا
یہ سب تو اے نگاہِ کرم بات بات بات

ان اشعار میں فراقؔ کی شخصیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ اشعار کسی صورت سے بھی اثر و تاثیر کی دولت سے بے نیاز نہیں، فراقؔ کے یہاں ہمیں جو کیفیت و اشاریت ملتی ہے وہ فی الحقیقت دورِ حاضر کے کم ہی شعرا میں نظر آتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فراقؔ اور ان کے پڑھنے والے کے درمیان ایک ایسا رابطہ پیدا ہو جاتا ہے جسے ہم ذہنی اور فکری حیثیت دے سکتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراق نے حسن اور اس کے التزامات کا مشاہدہ بہت غور سے کیا ہے۔ ہمیں ان کے یہاں وہ کیفیت بھی ملتی ہے جسے ہم (SENSUOUSNESS) سے تعبیر کرتے ہیں۔ شمیم زلف، نکہت شباب اور بوئے پیرہن جیسی بہت سی باتیں ہمیں نظر آتی ہیں، حسن کا خواب و بیداری حسن کی رفتار و گفتار، حسن کا خندہ و تبسم، حسن کا ناز و انداز، حسن کی جبیں پیشانی و گرہ ابرو، حسن کی دزدیدہ نگاہی اور نرگس نیم باز، حسن کا کرشمہ و اعجاز حسن کا فریب و افسوں، حسن کی خود نمائی و خود آرائی، حسن کی مہر فشانی و مہ چکانی ــــــ یہ تمام لوازمات جن سے غزل کی دنیا بنتی سجتی اور سنورتی ہے۔ فراق کے یہاں اپنے موثر انداز میں موجود ہیں۔ ؎

پلکیں نیند السائی زلفیں، نرم سیج پر بکھری ہوئی
ہونٹوں پر اک موج تبسم، سوؤ ہو یا جاگو ہو

وعدے کی رات مرحبا، آمد یار مہرباں
زلف سیاہ شب فشاں، عارض ناز مہ چکاں
برق جمال میں تری خفتہ سکون بیکراں
اور مرا دل تپاں آج بھی ہے تپاں تپاں

پادں سے فرق ناز تک برق تبسم نشاط

حسن چمن فروش کو دیکھ جہاں سے گلستاں

نرگسِ ناز مرحبا، زد میں ہے جس کی کائنات

چٹکی میں ناوک نگاہ، چھٹی بھویں کماں کماں

فراق نے تشبیہات و استعارات اور علامات کے استعمال کے سلسلہ میں روایت سے یقیناً بغاوت کی ہے اور یہ بغاوت خود ان کے لئے، موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے بہت سود مند اور خوشگوار ثابت ہوئی۔ اس سلسلہ میں ان کی وسعت مطالعہ کا کافی تعاون شامل ہے، انگریزی ادب کا وسیع و عمیق مطالعہ، ہندو دیومالا اور ہندی شاعری پر گہری نظر، اردو ادب کے گران قدر ورثہ سے مکمل واقفیت و آگاہی، ساتھ ہی ساتھ تاریخی حقائق کا علم اور مناظر فطرت سے قربت ـــــ یہ تمام ایسے عناصر ہیں جنھوں نے فراق کی شاعری کو نکھارنے اور قدر اول کی چیز بنانے میں کافی مدد دی ہے، یہی چیزیں ایسی ہیں جنھوں نے ان کے یہاں زور، بے ساختگی، رفعت، خلوص اور بے باکی پیدا کردی ہے۔ ان کی رباعیات اور غزلوں میں یہ تمام اجزا مکمل طور پر ملیں گے۔

زیر نظر مجموعہ "گل نغمہ" کلیات فراق کا پہلا حصہ ہے۔ یہ مجموعہ اپنی

ادبی، علمی اور شاعرانہ افادیت کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس
میں آپ کو غزلوں، نظموں اور رباعیات کا ایک قابل قدر اور حسین امتزاج
نظر آئے گا۔ اب یہ اہل نقد و نظر کا کام ہے کہ وہ فراق کی غزلوں اور نظموں
اور رباعیات پر جی کھول کر تنقید و تبصرہ کریں، میں اس مختصر اور ایک حیثیت
سے نامکمل "ابتدائیہ" کو فراق ہی کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

تھے اک پارۂ ابر کسی دن، دیکھے نہ دیکھے کوئی فراق
ملک سخن پر اک مدت سے اب تو ہمیں ہم چھائے ہیں

مفتی فخر الاسلام
ایڈوکیٹ، ہائیکورٹ

الہ آباد
۱۰ر جولائی ۱۹۵۹ء

اسلوب احمد انصاری

فراق گورکھپوری

فراق کی شاعری کی عمر کم و بیش پینتیس سال ہے۔ مشق سخن کی یہ طویل مدت روئداد ہے ایک گرم ذہن ایک مضطرب روح ایک حساس مزاج کے اپنے آپ کو پانے کی، اپنے فکری اور جذباتی سرمائے اور عمل کی توسیع و تہذیب کی۔ اپنی آواز کے ترنم اور تموج کو متوازن و منضبط کرنے کی۔ ابتدا میں اس میں ایک نوع کی آہستہ روی پائی جاتی تھی جسے دیکھ کر یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں فراق کے بارے میں بھی بالآخر وہی جملہ نہ دہرانا پڑے جو مشہور انگریزی شاعر گرے کے متعلق کہا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ اس نے کبھی بلا پس و پیش اور بھرپور انداز میں شاعری میں اپنے لب وا نہیں کئے۔ فراق کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کی ابتدائی کم گوئی کسی نفسیاتی امتناع یا عدمِ وفور کا نتیجہ نہیں تھی، نہ تکمیل کا کوئی ایسا ناقابل حصول معیار ان کے سامنے تھا جو ان کے پاؤں میں بیڑی

بن کر رہ جاتا ۔اور تخلیقی سرچشموں کے خشک ہو جانے کا سبب بنتا بلکہ رک رک کر کہنے کا یہ انداز غمازی کرتا تھا اس امر کی کہ وہ آئندہ جن بلندیوں پر پرواز کرنے والے ہیں اس کے لئے ابھی صرف پر تول رہے ہیں ۔ اپنے آپ کو دریافت کرنے اور ظاہر کرنے کے دوران میں انھیں جن مسلوں سے دوچار ہونا پڑا وہ صرف فن اور عروض کے مسئلے نہیں تھے ۔ بلکہ ایک وسیع اور ہمہ گیر مفہوم میں موضوع کے مسئلے تھے ۔ فراقؔ کی ابتدائی شاعری میں کئی اردو شاعروں کا رنگ جھلک اٹھتا ہے ۔ جن میں مومنؔ، مصحفیؔ اور امیرؔ مینائی قابل ذکر ہیں ۔ انھوں نے میرؔ سے بھی اثرات قبول کئے ہیں ۔ گو ان کے مرکزی احساسات میرؔ کے مرکزی احساسات سے بمراحل دور ہیں ۔ اور ان کی کئی تہیں ایسی ہیں ۔ جو مخصوص حالات کی بنا پر میرؔ کی عظیم عشقیہ شاعری میں نہیں ملتیں فانیؔ سے فراقؔ کی مماثلت محض ایک بے موقع الزام یا ایک خوشگوار لیکن گمراہ کن قسم کا حسن ظن ہے جس کے لئے کم از کم فراقؔ کے کلام میں کوئی سند موجود نہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ سند موضوعات ، نغماں ، لب و لہجہ اور مجموعی تاثر کی بنیاد پر ہی قائم کی جا سکتی ہے ۔ فانی کے یہاں تفلسف ، درد و کرب اور زندگی کی نفی ملتی ہے فراقؔ کے یہاں فکر ، سوز و گداز اور زندگی کا اثبات ، بعض انگریزی شاعروں مثلاً ڈن، ورڈز ورتھ اور سوینبرن وغیرہ کا اثر بھی بعض جگہ صرف مفرد اشعار میں اور کہیں کہیں تسلسل کے ساتھ نظر آتا ہے جس سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ فراقؔ نے ان شاعروں

سے شعوری یا غیر شعوری طور پر اکتساب فیض کیا ہے۔ اس پہلو سے دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراق کا ذہن انتخابی ذہن ہے۔ اس اصطلاح کو میں نے جس مفہوم میں استعمال کیا ہے اس کی پوری وضاحت آگے چل کر کروں گا۔ یہاں صرف اس قدر بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ فراق کی شاعری کے ہر دور میں احتساب اور تنقید خود کا عمل جاری رہا ہے۔ اور ان کے پورے کلام میں ذاتی انکشاف کی تازگی اور روشنی موجود ہے۔ مواد کے اعتبار سے بھی اور اس مواد کے لئے ایک خارجی وسیلہ وضع کرنے کے معاملے میں بھی ایسی صورت میں بعض جگہ کوتاہیوں کا راہ پا جانا ناگزیر تھا، اس لئے تنقیدی انصاف کا مطالبہ خامیوں کو چن چن کر نمایاں کرنے کی بجائے یہ ہے کہ ایسے زندہ، ارتقا پذیر اور نازک و لطیف ادراک کی تدریجی تکمیل کا راز معلوم کیا جائے اور اس نے جو بہترین چیزیں اردو غزل کو دی ہیں، ان کا تجزیہ کر کے ادبی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔

فراق نے اپنے کلام کے دیباچوں میں جگہ جگہ اپنی شاعری کے ماخذوں اور محرکات کی طرف اشارے کئے ہیں۔ ان اشاروں سے جہاں فراق کی شاعری کے مزاج اور خمیر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وہاں ان بیانات میں ایک حد تک مبالغہ بھی نظر آتا ہے جس کی تشریح میں بعد میں کروں گا۔ اس میں شک نہیں کہ فراق نے شروع ہی سے اردو زبان کے کلاسیکل شاعروں کا مطالعہ بہت تفصیل سے کیا تھا، اور گھر کے ماحول

اور ذاتی شغف کے باعث وہ ان کی روح سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے ان شاعروں کی جیسی حساس تحسین انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے پیش کی ہے، وہ یک رخی ہونے کے باوصف خاصہ کی چیز ہے لیکن اس کے باوجود اس پوری شاعری کے مخصوص میلانات کے خلاف ناآسودگی اور بغاوت کا جذبہ بھی محسوس کرتے رہے جب تک اس جذبے کے اسباب کی مناسب تحلیل وتشریح نہ کی جائے. اس وقت تک غزل میں فراق کے کارنامے کی اہمیت نمایاں نہیں کی جاسکتی۔ اس کے بغیر یہ بھی دشوار ہے کہ اس انتخابی ذہن کی کچھ وضاحت کی جا سکے، جس کا ذکر میں کرچکا ہوں

پرانی اردو شاعری کی وہ کون سی قدریں ہیں، جن کے احترام اور جن سے بڑی حد تک وابستگی کے باوجود وہ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے؟ اس سلسلے میں بہت سے امور قابل لحاظ ہیں سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ دور قدیم کے غزل گو شاعر، چند ایک کو مستثنیٰ کر کے، عشق کا ایک محدود تصوّر رکھتے ہیں جس سے میری مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ عشقیہ کیفیات یا عاشق کی زندگی کو ایک جامد سی چیز سمجھتے ہیں اور دوسری جانب وہ عشق کا رشتہ زندگی کی دوسری دلچسپیوں یا اہتم بالشان مسئلوں سے نہیں جوڑتے جس کے باعث قدرتی طور پہ ان کے تصوّرِ عشق میں ایک طرح کی سکڑن پیدا ہو جاتی ہے زندگی کی فراوانی اور رنگارنگی، اس کی خیر وبرکت، اس کے تسلسل وارتقا، اس کی وسعتوں اور بلندیوں کی طرف یہ عشق کوئی راستہ نہیں

دکھاتا۔ لکھنو کے تمام تر اور دلّی کے بھی اکثر شاعروں کے یہاں عشقیہ زندگی پوری زندگی سے کوئی نامیاتی علاقہ نہیں رکھتی یہ جوئے کم آب، کبھی بڑھ کر بحر بے کراں نہیں ہوجاتی۔ جذبات میں کہیں کہیں شدت اور خلوص کے باوجود سطحیت، گھٹن اور حریفانہ پن ضروری اجزا معلوم ہوتے ہیں۔ عشق کے تصور کو محدود کر دینے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ غزل کی شاعری میں جو بیشتر عشق و محبت کے جذبات کے گرد رقص کرتی ہے، موضوعات گنے چنے ہیں۔ اکثر شاعر تو محض قافیہ پیمائی پر قناعت کرتے ہیں، دوسرے اگر جدّت پیدا کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں، تو یہ کوشش بھی بالآخر مروّجہ مضامین اور خیالات ہی کے الٹ پھیر پر مشتمل ہوتی ہے۔ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ دلی کے شاعروں کے یہاں جذبے کی داخلیت اور اُس کا سوز و گداز پایا جاتا ہے اور دبستان لکھنؤ کے پیرووُں کے یہاں صرف اس کی خارجی مصوری۔ یہ عام بیان بھی تھوڑی سی ترمیم چاہتا ہے۔ بہرکیف یہ داخلیت اور خارجیت دونوں غیر تشفی بخش ہیں صحیح اور صحت مند خارجیت اس کا نام نہیں ہے کہ محبوب کا سراپا بیان کر دیا جائے اور اس کے مختلف اعضا کی ایک فہرست تیار کر کے ان کی تعریف میں بے سروپا باتیں کہی جائیں۔ داخلیت اور خارجیت کی سچی آمیزش کا مفہوم یہ ہے کہ عشق و محبت کی شدید داخلی اور انفرادی کیفیات کو انسانوں کی ہمہ گیر اور متنوع دلچسپیوں کے

پس منظر میں اس طور سے پیش کیا جائے کہ وہ تمام کیفیات عمومیت کی حامل بھی
بن جائیں اور فکر و فہم کی تحریک کا ذریعہ بھی۔ دراصل ادب اور شاعری میں انفرادی
نفس سے گریز تو کسی طرح ممکن اور مستحسن نہیں اور اس لئے پایان کار غور طلب
مسٔلہ اسی انفرادی نفس کی شمولیت (INCLUSIVENESS) یا بہ الفاظ
دیگر انفرادی نفس اور وجود محض یا اجتماعی نفس کے درمیان تطابق اور ہم آہنگی
کے مدارج کا مسٔلہ ہے۔ انہی چیزوں کے فقدان کی وجہ سے ایک طرح کی اکتا دینے
والی یکسانیت اور اعادہ غزل کا جزو غالب بن گئے ہیں اس کا ایک نتیجہ تو یہ
نکلا ہے کہ اگر ہم غزلوں کی اندرونی شہادت کی بنا پر کسی شاعر کے فکری اجزا کی
باز آفرینی کرنا چاہیں تو اس میں کامیابی مشتبہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کر سکتے
ہیں کہ اس نے اپنے مشاہدات یا حس اور ادراکی بصیرتوں کو جن اشعار میں
اتفاق سے ظاہر کر دیا ہے، انھیں ایک جگہ جمع کر دیں، اور دوسرا یہ کہ عام طور
سے غزلوں کی کوئی انفرادی فضا نہیں بن پاتی۔ جس کی مدد سے مختلف غزلوں
میں کوئی واضح امتیاز ان کے آہنگ کی بنیاد پر کیا جا سکے۔

یہ حقیقت بھی غور طلب ہے کہ شاعری کے پرانے سرمائے میں ہمیں
انسان اور کائنات کی ہم آہنگی کا احساس نہیں ملتا اور نہ زندگی کے ایجاب و
قبول کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اس کے اسباب انحطاط پذیر تمدن اور ایرانی تصوف

کی روایت میں ڈھونڈھے جا سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور کائنات دو الگ الگ اکائیاں ہیں، جن کے درمیان کوئی رشتہ مشترک نہیں۔ ایک طرح سے دیکھئے تو یہ بھی منطقی نتیجہ ہے اسی شدید قسم کی حریفانہ داخلیت کا، جس کا شکار یہ لوگ رہے ہیں۔ اگر شاعر اپنے دل کی دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے، اور اپنے جنسی اور عشقیہ جذبات ہی کے گرد مختلف قسم کے حسین جال بنتا رہے تو ظاہر ہے کہ وہ کائنات سے ہم آہنگی اور قربت کا احساس کیونکر کر سکتا ہے اور اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کے باوجود زندگی کے المیے کو قبول کر کے اس سے جذباتی سہارے کیسے حاصل کر سکتا ہے اس کے دو اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اول تو یہ کہ غم والم، رشک و رقابت اور درد و کرب کے جذبات کی ترجمانی غزل گو شاعروں کا اوڑھنا بچھونا بن کر رہ گیا ہے، دوسرے یہ کہ عاشق و محبوب کے درمیان معصوم سپردگی اور قدرتی پن کا رشتہ قائم نہیں ہو سکا۔ عام طور سے ان تعلقات کا جو تانا بانا ہمیں ان شاعروں کے یہاں ملتا ہے، وہ نہایت پر تصنع حریفانہ اور زندگی کی اعلیٰ قدروں سے منھ موڑنے کی ترغیب دلانے والا ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ گو اردو کے بیشتر شاعروں کے یہاں جذبات کی شدت، ان کی صداقت اور ان کے خلوص میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جذبات میں یک رنگی، سادگی اور سطحیت بھی بڑی حد تک

نمایاں ہیں۔ پوری اردو شاعری میں صرف غالب کی مثال ایسی ہے جن کے یہاں جذبات کی طرفگی اور پیچیدگی نظر آتی ہے، اور اسی لیئے یہ کہنا بڑی حد تک بجا ہے کہ غالب بہت کچھ پُرانے ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ نئے ہیں عشقیہ احساسات کے اظہار میں تہیں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں، جب کہ اس جذباتی زندگی میں تہیں ہوں، جس کی شاعری آئینہ دار ہے اور دوسری جانب اس ذہن میں پیچیدگی ہو جو جذبات کو گویا نبانے یا ان کے درمیان تخلیقی رشتہ قائم کرنے کا ذریعہ بنا ہو اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بنیادی انسانی احساسات کا ردّعمل جب شعر کے سانچے میں ڈھلتا ہے تو وہ اپنے کیف وکم کے اعتبار سے مختلف شاعروں کے یہاں مختلف طور پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ جذبات کی پیچیدگی، ان کا تضاد، ان کی گوناگونی، ان کی آوازوں کا زیروبم چاہے ان کے شدتِ تاثر میں کمی پیدا کردے (گو یہ بھی لازمی نہیں ہے) لیکن ان کے مفہوم میں ایک وسعت اور ہمہ گیری ضرور آجاتی ہے۔ اگر جذبات میں صرف سادگی ہو اور دوسرے اجزا کی کیمیا گری سے یہ سادگی زندگی میں بصیرت کا ذریعہ نہ بن پائے، تو سطحیت کا پیدا ہونا لازمی ہے ایسے شعری کارناموں کی اپیل نہ صرف محدود ہوتی ہے بلکہ ان میں ہر لحہ نئی تازگی حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے ، ، اور ان کی تشریح میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ کیونکہ ایسا کرنے کے لئے سمندر کی تہ سے موتی نہیں نکالنے پڑتے

بلکہ سطح پر ہی سب کچھ مل جاتا ہے۔

چونکہ اردو غزل کا فنی تصور فارسی سے مستعار ہے اس لئے یہ بات بہت عام ہے کہ عام غزل گو شاعر اپنی تشبیہوں کی تلاش میں یا تو سو فیصدی روایت پرست ہے یا آسمان پرست۔ وہ اس معاملے میں نہ تو اپنے مشاہدے سے کسب فیض کرتا ہے، نہ کبھی گرد و پیش اور زمین پر نظریں جماتا ہے وہ پرانی تشبیہوں اور استعاروں میں نیا آب و رنگ براہ راست مشاہدے کی قوت سے نہیں اُبھارتا۔ بلکہ صرف اپنے تخیل اور اپنی اخلاقی یادداشت کے بل بوتے پر۔ اس کا نتیجہ بھی تکرار اور یکسانیت نکلا ہے۔ ایسا کرنے سے مینا کاری اور چمک دمک ضرور بڑھ گئی ہے۔ لیکن اصلیت اور واقعیت ماند پڑ گئی ہے۔ ان غزل گو شاعروں نے ملک کے چاند اور سورج، یہاں کے آسمان اور زمین، یہاں کی مٹی اور ہوا یہاں کی بہار اور خزاں، یہاں کے پھولوں اور ذروں سے اپنے احساسات کو سجانے کے لئے کوئی مواد حاصل نہیں کیا۔ نہ اپنی تشبیہوں اور استعاروں کو براہ راست مشاہدے یا حسی تجربے کی بنیاد پر اٹھایا۔ بلکہ فارسی شاعری کی استعمال شدہ پیکر نگاری میں کچھ ترمیم و تنسیخ اپنے تخیل اور اپنی جدت پسند طبیعت کے مطابق کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا رشتہ زمین اور اس کی نعمتوں سے ٹوٹ کر روایت اور بے جان تخیل سے مل گیا۔ اسی

باعث ان تشبیہوں سے لطف اندوز ہوتے وقت ایک اجنبی فضا کا احساس برابر ہوتا رہتا ہے۔

عشق کا محدود تصور، انسان اور کائنات کی بے تعلقی اور زندگی کی نفی و تردید احساسات کی سادگی اور یک رنگی اور تشبیہات کی تلاش اور انتخاب میں روایت اور تخیل کو دخل، یہ ہیں مختصر طور پر وہ قدریں، جنھیں فراق کے وجدان شاعری نے قبول کرنے سے انکار کیا۔ پھر آخر فراق نے غزل کی کائنات کو وسعت بخشنے کے لیے اپنے آپ کو کس ذہنی عمل سے گزارا۔ فراق نے اردو کے جن شاعروں سے اثر قبول کیا ہے، ان میں میر، مصحفی اور غالب ہیں، میر سے انھوں نے سوز و گداز اور جذبے کی پختگی، مصحفی سے لمسیت اور شادابی اور غالب سے وسعت خیال اور احساس کی طرفگی اور پیچیدگی کو نمایاں کرنے کا فن حاصل کیا۔ انگریزی شاعر ورڈزورتھ اور ہندی اور سنسکرت ادب کے مطالعے اور مغربی علم وفن سے انھوں نے حیات و کائنات کا ادراک، فطرت سے وابستگی، زمین کے حسن اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا ولولہ لیا۔ فارسی شاعری سے نزاکتِ خیال اور ژرف بینی حاصل کی اور ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ سے یہ سبق سیکھا کہ ہندوستان کی شاعری میں ہندوستان کی روح اس طرح حلول کر جائے کہ وہ یہیں کی پیداوار معلوم ہونے لگے۔ لیکن ان سب اثرات کو بارآور بنانے میں خود ان کی نمو پذیر شخصیت اور

لطیف ادراک کو دخل رہا ہے۔ میں نے جس مسئلے کو ابتدا میں موضوع کا مسئلہ کہا تھا وہ یہ مسئلہ نہیں تھا کہ مروّجہ موضوعات میں سے ردّ و قبول کس معیار اور مقصد کے مطابق کیا جائے بلکہ یہ کہ محبت کی شدید داخلی کیفیات کی مصوری کے باوجود غزل کو پوری زندگی کا آئینہ اس انداز سے کیسے بنایا جائے کہ وہ فکر انگیز بھی ہو اور پہلو دار بھی ہو، اس کی بنیاد حقیقی تجربوں پر بھی ہو اور اس میں ہندوستان کی فضا کی تھرتھراہٹ بھی سنائی دے سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے فراق کو بڑا ریاض کرنا پڑا ہے۔

فراق کا ایک شعر ہے: ؎

یہی مقصدِ حیات عشق کا ہے   زندگی زندگی کو پہچانے

یہ زندگی کا پہچاننا کیا ہے، جسے شاعر نے عشق کا ماحصل قرار دیا ہے؟ یہ ہے حیات و کائنات کا وہ احساس، اس کی بے پناہ وسعتوں کے سامنے حیرت و استعجاب کا وہ تاثر، اس کے اسرار و رموز کو بے نقاب کرنے کا وہ جذبہ، اس سے ہم آہنگی کی جانب وہ میلان، جو دنیا کی عظیم شاعری میں پایا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بڑی اور قابل قدر عشقیہ شاعری محض جنسی تجربات کا بیان نہیں ہوتی۔ گو یہ ضرور ہے کہ جنسی تجربات ہی وہ بنیاد ہیں جن پر پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اگر ادب کا بحیثیت مجموعی تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ میں جنسی اور ارضی محبت ہی کے

جذبات کارفرما ملیں گے۔ لیکن عشقیہ شاعری میں جو تہیں، جو گہرائیاں اور جو وسعتیں نظر
آتی ہیں وہ شاعر کے ذہنی افق کی رفعتوں کا پھل ہوتی ہیں۔ شاعر کے تجربات عام انسانوں کے تجربات سے
مختلف ہوتے ہیں۔ یہ اختلافات ان تجربات کی شدت، لطافت اور گہرائی سے
عبارت ہوتے ہیں، کیونکہ شاعر کے ذہن اور روح کا سانچہ عام انسانوں کے ذہن اور
روح کے سانچے سے زیادہ حساس، زیادہ نادر اور زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ پھر خود
شاعر کے عنصری تجربے میں اور اس شکل میں جو وہ ادبی کارنامے میں اختیار کرتا ہے
بنایت فرق ہوتا ہے۔ وہ تجربہ جو عمل کی دنیا میں ظہور پذیر ہوتا ہے، کئی حیثیتوں سے
اس جمالیاتی اور فکری تجربے سے مختلف ہوتا ہے۔ جو حرف وصوت کی وساطت
سے ادبی کارنامے میں لازوال بن جاتا ہے۔ اگر شاعر صرف اپنے واردات قلبیہ
کی مصوری پر ہی قناعت کرے، تب بھی وہ ان جذبات کو گویا بنانے کی وجہ
سے جو سب کے دلوں میں ہوتے ہیں، مگر کسی کی زبان پر نہیں آسکتے۔ مناسب ردعمل
کو بیدار کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے، اور شاید اپنے فن کے بل بوتے پر حسن کا
جادو جگانے میں بھی، ایسی شاعری سچی، پُراثر اور خوشگوار ہونے کے باوجود روح
کی غذا نہیں بن سکتی۔ اچھا شاعر عام تجربات کے نادر اور معنیٰ خیز پہلوؤں کو اُجاگر
کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور بڑا شاعر اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ وہ تخیل اور
احساس کی تربیت کے ساتھ ذہنی تحریک کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ شاعر کا ادراک

جتنا لطیف، اس کا شعور جتنا پختہ، اس کا ذہن جتنا منظم اور مالا مال ہوگا، اسی نسبت سے اس کی تخلیق میں ابدیت کے عناصر پائے جائیں گے۔ شاعر اپنی دلچسپیوں کا دائرہ جتنا وسیع رکھے گا، اس اعتبار سے وہ تصورات کے نقوش میں رنگ آمیزی کرکے پڑھنے والوں کے ذہن میں کشادگی پیدا کر سکے گا۔ عشقیہ کیفیات تمام انسانی احساسات میں سب سے زیادہ اہم ہیں اور محبت کے روابط سے عام انسانی تعلقات کا جو تانا بانا تیار ہوتا ہے وہ بڑا نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے لیکن اسے خارجی طور پر متشکل کرنے میں گہرائی اور گیرائی، اس میں بلاغت اور معنی آفرینی، اس میں عظمت اور بلندی اسی وقت آسکتی ہے جبکہ ان کے پیچھے زندگی کی اعلیٰ قدروں کا کوئی نظام موجود ہو، چاہے شاعر نے شعوری طور سے اس کا رشتہ ان قدروں سے جوڑنے کی کوشش کی ہو، اور چاہے شاعر کا تربیت یافتہ ذہن جس نے ان قدروں کو قبول کر لیا ہے جذبات کی اس مصوری میں جھلک اٹھے۔ غیر پختہ جذبات خام مواد کی طرح ہوتے ہیں۔ جب تک وہ بھرپور شخصیت کی کیمیاگری کی بدولت ترفع نہ حاصل کر سکیں وہ فکری احساس میں تبدیل نہیں ہو سکتے اور احساسات کو نئی تازگی، ذہن کو نئی دولت اور روح کو نئی غذا نہیں فراہم کر سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ایسی شاعری جذبے اور اثر سے خالی ہوتی ہے۔ اس کا انحصار دراصل خود شاعر پر ہے۔ تو جذبے کی گرمی کو قائم رکھتے ہوئے اس میں فکر کی روشنی کو آمیز کرنا اچھے

شاعر کا فطری ملکہ ہے۔ فراقؔ کے یہاں بڑی عشقیہ شاعری کا یہ لازمی عنصر ہیں قدم قدم پر ملتا ہے جس نقطے سے وہ چلے ہیں، یعنی عشقیہ احساسات اس پر نظریں جمائے رکھنے کے باوجود ہیں ان کے اشعار میں حیات و کائنات کا ایک ایسا شعور ملتا ہے جو دوسرے شاعروں کے یہاں کمیاب ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ محض عاشق یا شاعر نہیں ہیں، بلکہ اس ہمہ گیر کائنات، اس کے مسائل اور اس کی گتھیوں سے جو اردگرد پھیلی ہوئی ہے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ عشقیہ کیفیات کا عرفان بخشنے کے ساتھ ہی نئی زندگی، نئی قدروں اور نئے شعور کی پرچھائیاں بھی دکھا دیتے ہیں۔ کائنات ان کے لئے ایک سوالیہ نشان بھی ہے، اور وہ اس کے غم اور مسرت، اس کے آدرش، اس کی تاریخ اور اس کے امکانات سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ وہ پڑھنے والوں میں وہ حیرت و استعجاب۔ وہ جستجو وہ سرخوشی اور وہ بصیرت پیدا کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ اپنے شعور کی وجہ سے خود حصہ دار ہیں۔ وہ جذبات کی بندگی نہیں قبول کرتے، نہ حواس کی عطا کی ہوئی دولت پر قناعت کرتے ہیں، بلکہ اس سے اپنے فکر کو شاداب بنانے کا کام لیتے ہیں یہ محض جذبے یا محض علم کی شاعری نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی روح کی داستان ہے جو حساس ہونے کے ساتھ ہی باشعور بھی ہے اس شاعری میں کوئی پیغام نہیں ہے۔ پھر بھی یہ شاعری ذہنی کشادگی کا باعث ضرور بنتی ہے اور جذبے کی داخلی دنیا میں سے ایک اچانک پن کے ساتھ نکل کر

دوسری وسعتوں میں کھو جانا چاہتی ہے، جن سے رشتہ قائم کر کے انفرادی زندگی زمان و مکاں کی طنابوں کو کھینچ کر ملا دیتی ہے۔ اور پھر بھی یہ رہتی ہے شدید حیاتی شاعری ہی، یعنی اپنے ہیولے کو تبدیل کئے بغیر یہ ایک وسعت، ہمہ گیری اور عمومیت حاصل کر لیتی ہے۔ اسی سبب سے یہ شاعری محض حسی آسودگی عطا نہیں کرتی بلکہ ذہنی اطمینان و انبساط بھی۔ ان اشعار کو پڑھئے جن سے جذبات و احساسات کی دنیا میں وسعتوں کے دریچے کھل جاتے ہیں۔ سے

دورِ حیات محض تھا اس کے حریم ناز میں
کیف و اثر کا ذکر کیا زیست کا بھی نشاں نہ تھا

کچھ اور کام تبا غم رگِ محبت میں — حیات و موت کے عنصر سمو چکا کب کا
فراق ایک ہوئے جاتے ہیں زمان و مکاں — تلاشِ دوست میں میں بھی کہاں نکل آیا
حسن جاناں کی جبینِ پُرسکوں — جیسے سو جائے حیاتِ بے قرار
لبِ جاناں ہیں پھر تبسم ریز — ہو گئی نبض کائنات بھی تیز
وہ جن کے حال میں لو دے اُٹھے غمِ فردا — وہی ہیں انجمنِ زندگی کے چشم و چراغ
یہ کاروانِ زمانہ چلے ہی جانا ہے — نہ خوفِ شامِ غریباں نہ فکرِ صبحِ وطن
فضاؤں کی وہ کیفیت زماں مکاں کی حیرتیں — مجھے بھی یاد ہیں تری نگاہ کی حکائتیں
رکا ہے قافلۂ غم کب ایک منزل پر — کب انقلاب زمانہ کا ہمرکاب نہیں

جولانگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں — منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں
ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی — ابھی حیات کے چہرہ پہ آب وتاب نہیں
دکھاتو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے — خراب ہو کے بھی یہ زندگی خراب نہیں

عشق حیاتِ محض کی لرزشِ بے قرار ہے
دردِ نہاں کی ذمہ دار سازشِ جسم وجاں نہیں

ابھی ہر شے سے ہوتی ہو نمایاں شانِ انسانی — ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہو کمی اپنی
زمین جاگ رہی ہو کہ انقلاب ہے کل — وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں
ہوا ہے گردشِ دوراں کا ایک دور تمام — سکونِ یاس جو حاصل ہوا محبت کو
رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی — وہ پو پھٹی، وہ نئی زندگی نظر آئی
کہیں زمان ومکاں میں ہو نام کو بھی سکوں — مگر یہ بات محبت کی بات پر آئی

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی
جھپک رہی ہیں زمان ومکاں کی بھی آنکھیں
مگر ہے قافلہ آمادۂ سفر پھر بھی
شبِ فراق سے آگے ہو آج میری نظر
کہ کٹ ہی جائے گی یہ شام بے سحر پھر بھی

کہیں یہی تو نہیں کاشفِ حیات و ممات
یہ حسن و عشق بظاہر ہیں بے خبر پھر بھی

توڑا ہے لامکاں کی حدوں کو بھی عشق نے
زندانِ عقل تیری تو کیا کائنات ہے

زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

وجود و عدم گردِ راہِ سفر ہیں
کہاں جائے گا کاروانِ محبت

خندۂ صبحِ ازل تیرگیٔ شامِ ابد
دونوں عالم ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

اس بزمِ بے خودی میں وجود و عدم کہاں
چلتی نہیں ہے سانس حیات و ممات کی

ایک آئے گی نظر اصلیتِ غیب و شہود
دونوں عالم ترے دیدار میں یکساں ہونگے

تہوں میں دل کی جہاں کوئی واردات ہوئی
حیاتِ تازہ سے لبریز کائنات ہوئی

تھی ایک کاوشِ بے نام دل میں فطرت کے
سوا ہوئی تو وہی آدمی کی ذات ہوئی

ہر اک ابد کا مسافر ہر ایک خانہ بدوش
سرِ دیارِ محبت کوئی مکاں نہ مکیں

ابھی جبینِ بشر منتظر سی ہو جیسے
کہ آدمی ابھی فطرت کا شاہکار نہیں

فراقؔ کے اشعار میں ایک پہلو جو بہت نمایاں ہے وہ فضا کا احساس ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک دیدۂ نگراں رکھتے ہیں اور ان کا سماعی تخیل بہت رچا ہوا ہے۔ ان کے یہاں فضا کی موسیقی اور اس کا ارتعاش ملتا ہے۔ یہ بات میں نے رومانیت کے سطحی تخیل سے متاثر ہو کر نہیں کہی ہے۔ عشقیہ جذبات کی مصوری کے دوران میں فراقؔ انفرادی زندگی اور مظاہرِ فطرت کے

وجود بسیط میں ایک مشترک رشتے کا احساس کرتے ہیں۔ وہ اپنی نبضوں کی رفتار پر کائنات اور فضا کی دھڑکنوں کو محسوس کرتے اور اس نغمے کو اپنے قوی تخیل کے ذریعے اسیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے اشعار پڑھ کر دو باتوں کا پتہ چلتا ہے اول تو شاعر کا وہ احساس تنہائی جو بار بار اسے اپنی داخلی دنیا سے نکل کر بلندیوں کو چھو لینے کی ترغیب دیتا ہے۔ دوسرے اس نقطۂ اتصال کو پا لینے کا جذبہ جو انسان اور کائنات کے درمیان نامعلوم طریقے پر موجود ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ اس معاملے میں فراق انگریزی کے رومانی شاعروں خاص طور سے ورڈزورتھ سے بہت متاثر ہوئے ہیں جس نے انسان اور فطرت کے درمیان سے حجابات اٹھانے کے لئے اپنے باطنی اور عارفانہ تجربات سے استفادہ کیا۔ فراق نے اپنی شخصیت کے اس خاص میلان کی طرف خود بھی اشارہ کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ فضا کی پاکیزگی اور طہارت، اس کی پہنائیوں اور اس کے مخصوص زیر و بم کا جو احساس شروع سے فراق کے مرکزی احساسات کا جزو غالب تھا اسے ان کے شعور کی پختگی اور مطالعے کی حسن کاری نے چمکا دیا۔ فراق کی شاعری میں عام طور پر دو امور بہ یک جنبش نظر اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یعنی ان کا ذوق جمال اور احساس نغمہ اور انھیں دونوں عناصر کی مدد سے وہ کائنات کے حسن اور اس کی موسیقی کو بہت جلد اپنے ادراک کا موثر حصہ بنا لیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی شعری دنیا

میں ستاروں کے راز دار بن گئے ہیں اور اپنے کانوں سے فضا کی اس تھرتھراہٹ کو سُن رہے ہیں۔ جو بہت کچھ ان کے دل کی دنیا سے قریب ہے یوں تو ہر شاعر کسی نہ کسی حد تک فضائی احساس رکھتا ہے۔ کیونکہ بہرحال اگر وہ چاہے بھی تو اپنے اردگرد کی دنیا سے آنکھیں۔ تو نہیں بند کر سکتا۔ لیکن فراؔق کے یہاں خاص طور پر جو محویت، جو ہم آہنگی، جو قربت ملتی ہے، وہ اُن کے اپنے باطنی ردِ عمل کا پتہ دیتی ہے۔ اس ردِ عمل کے طریقے بھی مختلف شاعروں کے یہاں مختلف انداز سے ملتے ہیں فراؔق کی اکثر نظمیں اور غزلیں، ان کے اپنے بیان کے مطابق شب کے پچھلے حصّے میں لکھی گئی ہیں، جب پوری کائنات پر ایک پُراسرار خاموشی، ایک لطیف اور دلنواز محویت کا عالم طاری ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ شاعر کا ذہن اپنی کیفیات سے ایک دم فطرت کے خاموش حسن اور اس کے مدھم سنگیت کی طرف منتقل نہ ہو جائے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فراؔق کے بہت سے اشعار میں ایک نغمگی، ایک تموج ایک پاکیزگی اور ایک حیرانی و استفسار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ فراؔق جوؔش کی طرح شاعرِ فطرت نہیں ہیں۔ وہ تمام تر انسانی تعلقات کے شاعر ہیں لیکن ان کے بہت سے اشعار میں ایک لامحدود فضا کا احساس ہوتا ہے جو غالباً نتیجہ ہے اس امر کا کہ وہ اپنی اندرونی نغمگی کو فطرت اور فضا کے ترنم سے ہم آہنگ کر دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں یہ فضائی احساس ہمیں انگریزی شاعر ورڈزورتھ اور نیگالی

شاعر ٹیگور کے لازوال نغموں میں ملتا ہے۔ گوان دونوں شاعروں کے یہاں یہ احساس فراق کی نسبت زیادہ گہرا، زیادہ رچا ہوا اور زیادہ معنی خیز ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ فراق نے اپنے طور پر اس کیفیت کو محسوس کیا ہے اور وہ اسے اپنے مزاج میں پورے طور پر سمونے میں کامیاب ہو گئے ہیں ان کا یہ فطری میلان، ان کے عشقیہ جذبات سے مل کر ایک نئے رنگ میں ظاہر ہوا ہے اس کے پیچھے ایک بہت بڑی تہذیب بھی ہے، جس نے ان نغموں کی آبیاری کی ہے۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو شاعری یا کم از کم غزل میں فراق سے پہلے اس نغمے کی گونج سنائی نہیں دیتی ؎

گرہ دوں شرار برق دلِ بے قرار دیکھ
جس سے یہ تیری تاروں بھری رات رات ہے

تمام خستگی و ماندگی ہے عالمِ ہجر
تھکے تھکے سے یہ تارے، تھکی تھکی سی یہ رات

جو تیرے گیسوئے پرخم سے کھیل بھی نہ سکیں
بدن چرائے وہ جسدم ادھر سے گزرے ہیں

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

میں آسمانِ محبت پہ رخصتِ شب ہوں
ترا خیال کوئی ڈوبتا ستارہ ہے

زمینِ رہگذر کے ذرّے گہری سانس لیتے ہیں
سکوں آثار کتنی ہے ادائے کم روی تیری

ستارے کھو گئے ہیں روپ کے سنگیت میں اکثر
کہاں سازِ شبِ مہتاب میں ہے نغمگی تیری

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری، وہ رات رات ہوئی

وہ رات گوش بر آواز تھے جب انجم و مہ
تری نگاہ کہانی سی جیسے کہہ جائے

تارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکائے سوتی ہے   دبے پاؤں یہ کس نے آکے خواب زندگی بدلا

فراق نے محبت کے ان موضوعات کی طرف جو ان کی شاعری کا مرکز و محور ہیں، خود ہی ایک شعر میں اشارہ کر دیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

ایک جانی ہوئی دنیا، اک عالم حیرت ہے
ان دونوں کا مل جانا دنیائے محبت ہے

فراق اس سلسلے کے شاعر ہیں جس کے میر، مومن، غالب، آتش، مصحفی، حسرت اور جگر ہیں۔ انہوں نے اپنی شعری دنیا کو انھیں شدید قسم کے داخلی جذبات و کیفیات سے آراستہ کیا ہے، جو غزل کے مرکزی موضوعات کہے جا سکتے ہیں۔ مگر فراق نے ان موضوعات کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور حسن و عشق کی نفسیات کو ذاتی تجربات کی روشنی میں پڑھنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کی اپنی آواز اور لے بن گئی ہے۔ حسن و محبت کا موضوع انتہائی فرسودہ ہونے کے باوجود دنیا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ محبت کی نفسیات میں تبدیلی، سماجی تبدیلیوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ انسانی زندگی ایک عضوی کل ہے جس کے کسی ایک پہلو کی تبدیلی تمام دوسرے پہلوؤں پر اثرانداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ابتدائی زمانے کا انسان حسن کے جلوؤں سے جس طرح متاثر ہوتا اور اپنے تاثرات کو الفاظ کی قبا پہناتا تھا۔ زمانہ حاضر کا انسان اس سے مختلف طور پر متاثر ہونے کے لئے مجبور ہے۔ ولی اور میر کی غزلیں

جن کی پُرکاری اور شادابی کو وقت کی گردش دھندلا نہیں کر سکی ہے ، اردو شاعری کے عالمِ طفلی کے معصوم اور قدرتی نغمے ہیں ۔آج ان نغموں میں عمر کی پختگی ، بیداری اور آگہی پیدا ہو گئی ہے ۔کیونکہ اجتماعی زندگی کے انقلابات احساس کی بنیادیں بھی تبدیلی کا موجب بنتے رہتے ہیں ۔جس کا مفہوم یہ ہے کہ جذبات کی تہیں ، ان کی آوازیں ، ان کی موسیقی ، ان کا اتار چڑھاؤ ، ان کی کیفیت ، غرض ہر چیز بدلتی رہتی ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ صحیح معنوں میں عظیم شاعر جذبے کی داخلی دنیا کے کثیر عناصر کو اس طرح اپنے شعور میں سمو لیتا ہے ۔اور اپنے آفاق گیر وجدان کے سہارے بہت سی اگلی منزلیں اتنی آسانی کے ساتھ طے کر لیتا ہے کہ اس کے احساس کا سانچہ ، احساس کے آنے والے بہت سے سانچوں کی نشان دہی کرتا ہے لیکن ایسے شاعر دو چار ہی ہوتے ہیں ۔ انگریزی ادب میں اس کی مثال شیکسپیئر اور اردو میں غالبؔ ہیں ۔

تاہم یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ فراقؔ کے جذباتی ردعمل اور اُن کے سوچنے کے انداز میں جو ایک نوع کی طرفگی اور پہلوداری ہے وہ ان کے معاصرین کے یہاں نہیں ملتی ۔لیکن اس سے بھی زیادہ میں جس امر کو اہمیت دیتا ہوں ، وہ ہے ان کا زندگی کو قبول کرنے کی طرف میلان اور حسن و عشق کے روابط میں پاکیزگی قدرتی پن اور جذباتی آسودگی کے عناصر ۔ یہ بات ہمیں حسرتؔ کے کلام میں بھی ملتی ہے ۔مگر حسرتؔ کے یہاں سادگی و پُرکاری ہے ۔ فراقؔ کے یہاں پیچیدگی اور ندرت

حسرت کی عشقیہ شاعری بڑی تندرست خوشگوار اور جسم اور روح کو بالیدگی عطا کرنے والی ہے۔ مگر ہے پھر بھی پرانا رنگ لئے ہوئے ہے، گو یہ رنگ بہت نکھرا ہوا ہے اور فراق کے یہاں یہ ایک نئے ذہن، ایک نئے وجدان کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ اس کا آہنگ جدید ہے۔ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کی جو تصویریں ہمیں فراق کی رباعیوں میں ملتی ہیں وہ بعض جگہ انتہاپسندی کے باوجود بڑی نادر اور دلکش ہیں اور اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ یہی تصویریں تناسب باطنی کی تبدیلی کے ساتھ ہمیں ان کی غزلوں میں بھی نظر آتی ہیں۔ ان رباعیوں کی اہمیت کو جو یہ کہہ کر گھٹایا گیا ہے کہ یہ تلسی داس، سور داس اور میرا بائی کے نغموں کی آوازِ بازگشت ہیں، اسے میں قطعی مہمل بات سمجھتا ہوں کیا اردو غزلیں اور قصیدے فارسی اور عربی شاعری کی آواز بازگشت نہیں معلوم ہوتے؟ بایں ہمہ ہم میر مومن، غالب اور ذوق کی عظمت کا سکہ ماننے میں تامل نہیں کرتے۔ موضوع بحث یہ امر نہیں ہونا چاہیئے کہ کس شاعر کے فیضان کے سرچشمے کون کون سے ہیں بلکہ یہ کہ اس نے مختلف اثرات کو اپنی شخصیت کی آنچ میں تپا کر کس طرح کندن بنایا ہے، خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اس لئے کہ یہاں فراق کی رباعیوں سے بحث مقصود نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس شاعر نے "روپ" کی رباعیاں لکھی ہیں اسی نے وہ بے شمار غزلیں بھی کہی ہیں جن سے فراق کی شاعری

دراصل عبارت ہے۔ یہ دونوں شاعر الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شاعر کے دو رُخ ہیں جن میں کوئی باہمی تضاد نہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حیات و کائنات کا جو کلی وجدان فراقؔ رکھتے ہیں وہ چونکہ احساس تکمیل کے ساتھ فن کی ایک شکل میں ادا نہیں ہو سکا، اس لئے اس نے اپنے اظہار کے لئے دو صورتیں اختیار کر لیں۔

فراقؔ کی غزلوں پر جو یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ وہ ہوس پرستی کے مظاہرے ہیں (اور یہ اعتراض اثرؔ لکھنوی نے بڑی بلند آہنگی کے ساتھ کیا ہے) یا ان میں لذتیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، یہ اعتراض نقطۂ اعتدال کو کھو دینے سے پیدا ہوا ہے میرا خیال ہے کہ اس میں تھوڑی بہت صداقت تو ضرور ہے مگر اتنی نہیں جتنی فراقؔ کے بعض جانب دار معترضین سمجھتے ہیں۔ یہ خامی وہاں اور اس وقت جھلکتی ہے، جہاں اور جب فراقؔ جنسی تجربے کو جمالیاتی یا فکری تجربہ بنانے میں ناکام رہتے ہیں مجموعی طور پر ان کے یہاں عشقیہ تجربوں کے بیان میں وہ پاکیزگی وہ معصومیت وہ سپردگی نظر آتی ہے۔ جو صرف معدودے چند شعرا کے یہاں مل سکتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے پوری زندگی کو جس میں جنسی زندگی لازمی طور پر شامل ہے۔ ذہنی پس و پیش کے بغیر قبول کرنے کا اور جنسی اور عشقیہ تعلقات کو کامل سچائی اور صحت مندی کے ساتھ برتنے کا۔ اس میں وہ برتنے اور جذباتی گھٹن نظر نہیں آتی جو لکھنو اور دلی

کے شاعروں کا طرۂ امتیاز تھی۔ فراقؔ کے اس شعر پر ؎

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے شباب کی دوشیزگی نکھر آئی

بڑی لے دے کی گئی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اردو کے بہت کم اشعار ایسے ہوں گے
جن میں انھیں پابندیوں کے اندر کسی نے اتنے قدرتی پن اور اتنی لطافت کے ساتھ
ایسی بات کہی ہو۔ آپ اسے بہترین عشقیہ اشعار میں چاہے شمار نہ کریں لیکن یہ شعر
جس پیش پا اُفتادہ حقیقت کا برجستہ اور معنی خیز اظہار ہے اس کے پیش نظر میں
اسے اردو کے اچھے اشعار میں سے ایک ضرور کہوں گا۔ فراقؔ بنیادی طور پر عشق کی
جسمانیت اور حسن کی نفسیات کے شاعر ہیں اور میرا یہ خیال ہے کہ ان کے یہاں یہ
اچھوتا رنگ ہندی اور سنسکرت ادب کے مطالعے سے آیا ہے۔ جس طرح فراقؔ
نے دھرتی کی عظمت اور تقدس کا جذبہ، کائنات سے قربت کا احساس، اس کے
رس اور نغموں کا ادراک اپنے اس مطالعے سے اخذ کئے ہیں اسی طرح یہ بھی قرینِ
قیاس ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان تعلقات کا یہ قدرتی پن، اپنایت کا یہ احساس
دھیمے اور بعض جگہ اچانک پن کے ساتھ جانے پہچانے تجربوں کا یہ بیان اور ان میں
یہ حلاوت، یہ سب چیزیں بھی انھوں نے اسی ماخذ سے حاصل کی ہیں لیکن میں
پھر اس بات پر زور دوں گا کہ ان اثرات کو جذب کرنا خود ان کی شخصیت کے

غالب عناصر کی شمولیت کے بغیر ناممکن تھا۔ میں نے فراقؔ کی غزلوں کو پڑھتے وقت ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ ان کی فضا غزلوں کی مروجہ فضا سے یکسر مختلف ہے۔ یہ بات اقبالؔ کی غزلوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اقبالؔ کی غزلیں ارضی محبت کے ترانے کب ہیں؟ وہ تو اس عظیم مفکر کے آفاقی پیغام کی اشاعت کا صرف ایک ذریعہ ہیں۔ فراقؔ کی غزلیں ان کے انفرادی جذبات سے بوجھل ہیں۔ اس ساز کے ہر تار سے ان کی روح کا سوز و گداز، اس کا کیف و سرور، اس کی افسردگی اور نغمگی اس کا اضطراب و انبساط، اس کی سپردگی اور معصومیت اس کا شعور و آگہی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہ غزلیں کسی اور دنیا کی معلوم ہوتی ہیں۔ ہرگز نہیں۔ فراقؔ کی غزلوں کی روح سرتاسر ارضی ہے جس طرح ہر دور کے ادب میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ اور ادبی بغاوت ادبی روایات کو بالکل شکست نہیں کر دیتی، بلکہ ان کے بہترین عناصر ہی سے اپنی زندگی کا ساز و سامان فراہم کرتی ہے۔ اسی طرح فراقؔ نے غزل کے پُرانے اسالیب میں ہمہ گیر بنیادی تجربوں کو نئے زورِ بیان (EMPHASIS.) نئے لب و لہجہ اور نئے آہنگ کے ساتھ سمو کر غزل کی کائنات کی توسیع کی ہے۔ ان تجربات کو جس شخصیت نے وحدت عطا کی ہے، یا یہ تجربات جس کٹھالی سے ہو کر گزرے ہیں وہ بالکل انفرادی قسم کی ہے جو محبت کی نفسیات پر گہری نظر رکھتی ہے۔ اگر فراقؔ کے منتخب اشعار میں وہ خصوصیات

جھلک اٹھیں جن کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں تو ان کے ایسے اشعار کو نظر انداز کر دینے میں ہم حق بجانب ہوں گے جن پر کسی حد تک تصنع، لذتیت اور آورد کا شبہ گزرتا ہے۔ ایسے بہت سے اشعار میں سے جو فراق کے بہترین عشقیہ اشعار کہے جا سکتے ہیں چند ایک ملاحظہ کیجئے ؎

گلوں کی جلوہ گاہِ ناز میں نہ ڈھونڈھ اب مجھے

میں نقش تھا مٹا دیا، چراغ تھا بجھا دیا

ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا
آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

جہاں بھی جستجوئے دوست میں ٹھہر جاتے
یقین جان کہ منزل قریب ہی ہوتی

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

نشاط حسن ازل کو بھی وجد آجاتا
دکھی ہوئی مگر اتنی رگِ حیات نہیں

احساس دیدہ و دل یہ ہے بدن کو اُس کے
دیکھیں تو حیرتیں کچھ مانوس ہو رہی ہیں

سرِ راہِ محبت آدمی کی سانس کیوں اکھڑے

نفس کی موج کو دے دے ادائے کم روی اپنی

کبھی کبھی اسے نظریں بچا کے دیکھا تھا
حریف عمر تھا تھے وہ نیم لمحے بھی

کیا ہے سیر گہ زندگی میں رخ جس سمت
ترے خیال سے ٹکرا کے رہ گیا ہوں میں

نثارِ وعدۂ دیدار پھر بھی سوچ سے ہے — تجھے بھی بھول نہ جاؤں میں دیکھ کر تجھ کو

یہ سر سے تابقدم محویت کا عالم ہے — کہ گھرے سوچ میں جسطرح ڈوب جائے بدن

ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست — وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا

حساس کم نہیں ہے محبت بھی اور یوں — اس کو غم و نشاط سے دل بستگی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں — لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

رگوں میں گردشِ خوں ہو کہ لے ہر نغمے کی — وہ زیر و بم کا ہے عالم کہ جسم گاتا ہے

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی — اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

فضا تبسم صبح بہار تھی لیکن — پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

صاف لو دے اٹھی اداس فضا — مسکراہٹ تری جو یاد آئی

ہو گئی کائنات رنگا رنگ — وہ گلابی نظر نے چھلکائی

کچھ انتظار کا عنوان تو بدل جاتا — جو غم کی شام ہوئی تھی تو صبح بھی ہوتی

یہ اختصار بڑی چیز ہے محبت میں — تری نگاہ مری شرح خامشی ہوتی

بنے گی غم کے عناصر سے اک نئی دنیا — نشاطِ حسن سے تم پوچھ لو اگر شک ہے

دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

بس جذبِ حسنِ یار کہیں پھر ابھر نہ آئیں — وہ نقش آرزو جو مٹائے ہوئے سے ہیں

عجب کیا کھوئے کھوئے سے جو رہتے ہیں ترے آگے
ہمارے درمیاں اے دوست لاکھوں خواب حائل ہیں

حساس کس قدر ہے محبت کی زندگی ہم بے خبر ہیں اور انھیں پائے ہوئے سے ہیں

صحبت شب کی داستاں اس میں سمٹ کے آگئی
پچھلے پہر کو بزم میں شمع کی تھرتھری نہ دیکھ

جام دل کی تہ میں موج خوں سی آ کر رہ گئی اپنی قسمت میں کوئی چھلکا ہوا ساغر کہاں

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

بس اک تسلسلِ تغیر حال قائم ہے نصیبِ عشق فنا و دوام بھی تو نہیں

تجھے تو ہاتھ لگایا ہے بارہا لیکن ترے خیال کو چھوتا ہوا میں ڈرتا ہوں

فراق کی شاعری کے مزاج کا اگر کوئی اندازہ لگانا چاہے تو اسے فراق کی تشبیہوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ تشبیہوں کے انتخاب سے شاعر کے ذہنی عمل کا پتہ چلتا ہے میں نے شروع میں کہا تھا کہ فراق نہ روایت پرست ہیں نہ آسمان پرست۔ وہ جب عشقیہ کیفیات کی مصوری کرتے ہیں۔ یا محبوب کے خدوخال یا ناز و ادا کا کوئی مرقع پیش کرتے ہیں تو قطعی منفرد اور مخصوص انداز میں۔ جس سے میری مراد یہ ہے کہ وہ ان تشبیہوں اور استعاروں کو استعمال نہیں کرتے، جو اردو شاعروں کے لئے تکیہ کلام بن گئے تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ عمداً ان سے احتراز کرتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں

براہ راست مشاہدے پر بھروسا کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ بہت سی ایسی تشبیہیں جن کی طرف ذہن کبھی منتقل نہیں ہوتا تھا، ان کے یہاں موجود ہیں۔ مزید یہ کہ ان کے یہاں بہت سی تشبیہوں کا تلازمۂ ذہنی بدل گیا ہے۔ فراقؔ مروجہ تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں جدت پیدا کرنے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اپنے مفہوم کو پورے طور پر ادا کرنے کے لئے ان چیزوں کی طرف توجہ کرتے ہیں جو ہندوستان کے اصول اور مزاج سے قریب تر ہیں۔ اور ہم آہنگی رکھتی ہیں۔ دراصل فراقؔ نے ایسا جان بوجھ کر اور عصبیت کی بنا پر کیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس سے اردو غزل میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے۔ فراقؔ کی تشبیہیں بڑی اچھوتی، خیال انگیز اور جان دار ہوتی ہیں۔ ان کا ذوقِ جمال بڑا رچا ہوا، بڑا مہذب، بڑا صحیح اور بڑا گہرا ہے۔ ان کے کان موسیقی سے نا آشنا ہیں۔ ان کی تشبیہیں جامد نہیں ہوتیں بلکہ متحرک اور زندہ۔ فراقؔ کا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے کہ کہ ہندوستان کی شاعری میں ہندوستان کی روح اسی طرح بھری ہوئی ہونی چاہئے جس طرح فارسی شاعری میں ایرانیت، فراقؔ کو زمین سے اتنی ہی محبت ہے جتنی انگریزی ناول نگار لارنس کو۔ فراقؔ نے بعض ایسی تشبیہیں استعمال کی ہیں جو جانی پہچانی ہونے کے باوجود نئی معلوم ہوتی ہیں۔ اکثر ایسی ہیں جو اس سے پہلے اردو کے کسی شاعر نے استعمال نہیں کیں لیکن جن کے استعمال میں ایک خاص حلاوت، ایک خاص دلکشی، ایک خاص تازگی معلوم ہوتی ہے۔ فراقؔ اپنے اس عزم میں کامیاب ہوئے ہیں کہ ان

کی شاعری میں ہندوستان کی فضا کی تھرتھراہٹ محسوس ہو۔ انھوں نے ہندو دیو مالا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ہندی شاعری میں چاہے وہ پروازِ تخیل، وہ نکتہ آفرینی وہ ژرف نگاہی نہ ہو، جو فارسی شاعر کے ماتھے کا جھومر ہے۔ اس میں جو ارضیت، جو رس، جو نغمگی، جو سادگی اور سرشاری ہے وہ یقیناً ایک انمول موتی ہے۔ اور فراقؔ نے ان سب عناصر کو غزل کے سانچے میں سمونے کا التزام کیا ہے۔ فراقؔ کی شاعری اعلیٰ درجہ کی حسیاتی شاعری ہے۔ انھوں نے اس دیوی کے سنگھار کے لئے جو سامان فراہم کیا ہے، وہ ہے ہندوستان ہی کی سرزمین کا ـــــ فراقؔ کی شاعری کی فضا کچھ ایسی ہی ہے، جیسی شکنتلا کے ناٹک کی فضا۔ فراقؔ کا یہ کارنامہ بہت اہم ہے ایسی تشبیہوں کا انتخاب کرنے سے جو تجرباتی اعتبار سے نہ صرف صحیح بلکہ ہماری رسائی میں بھی ہوں، فراقؔ کی شاعری میں واقعیت اور اصلیت کے عناصر بڑھ گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ تشبیہیں بھی جو فارسی سے مستعار تھیں اور جنھیں دوسرے اردو شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ ہمارے مزاج میں اس درجہ رچ بس گئی تھی کہ ان سے کام لے کر ہمارے شاعروں نے بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں اور پڑھنے والوں کے اندر خاطر خواہ ردِعمل بیدار کیا ہے۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ آخر اس معاملے میں براہ راست تجربے اور مشاہدے پر کیوں نہ بھروسہ کیا جائے اور ایسی تشبیہیں کیوں نہ لائی جائیں جن سے پڑھنے والے کا شعور کھل اٹھے۔ فراقؔ کے یہاں محبت کا جو تصور ملتا ہے ،

وہ خالص جسمانی محبت کا تصوّر ہے وہ صرف مادّیت کے پرستار نہیں ہیں بلکہ مادے کی روحانیت کے بھی۔ انھوں نے جنس کو اسی طرح روح کا مرتبہ دے دیا ہے جس طرح انگریزی ناول نگار لارنس نے۔ لارنس ہی کی طرح وہ زمین سے چپٹے رہتے ہیں۔ گو کبھی کبھی آسمان کی طرف بھی آنکھیں اٹھا کر دیکھ لیتے ہیں۔ عشق کی جسمانیت کا اس قدر قائل ہونے اور زمین سے اس شدید وابستگی ہی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ان کی تشبیہیں اتنی تازہ، اتنی پُرحلاوت اور اتنی دلکش ہیں۔ فراقؔ کی تشبیہوں کی دل کشی کا راز چند عناصر کے جمع ہو جانے میں ہے۔ اول ان کی جمالیاتی حس، دوسرے ان کا شاداب تخیل، تیسرے ان کی زمین سے محبت، چوتھے ان کا تصورِ عشق، پانچویں ہندی اور سنسکرت ادب کا فیضان اور چھٹے تجربے اور مشاہدے کی باریک بینی اور صحت انھیں مختلف اور متضاد عناصر نے مل جل کر اس فضا کی تعمیر کی ہے جسے وہ ہندستانیت سے تعبیر کرتے ہیں، اور جسے اپنی شاعری کے باطن میں پیوست کر دینے کے وہ اتنے مشتاق ہیں۔

چند مثالیں دیکھیے ؎

خیالِ گیسوئے جاناں کی وسعتیں مت پوچھ
کہ جیسے پھیلتا جاتا ہو شام کا سایہ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

دلوں میں داغ محبت کا اب یہ عالم ہے — کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

رنگ امواج رقص صبح بہار — روپ دیتے ہیں ساز کا عالم

وہ پچھلی شب نگہ نرگس خمار آلود — کہ جیسے نیند میں ڈوبی ہوئی ہو چندر کرن

یہ تیرا شعلۂ آواز ہے کہ دیپک راگ — قریب و دور چراغ آج ہو گئے روشن

وہ نوبہار ناز اٹھا فضائے صبح جاگ اٹھی — وہ تازگی، وہ حسن وہ نکھار وہ صباحتیں

روپ کا رہ رہ کے جھلک مارنا — پھولوں سے جس طرح اُڑیں تتلیاں

کروٹیں لے افق پہ جیسے صبح — کوئی دوشیزہ رسمساتی تھی

حسن کی صباحت کو کیا بتایئے جیسے — چاندنی مناظر پر پچھلی رات ڈھلتی ہے

رنگ رُخ کھلا اس طرح آنچ عشق کی کھا کر

پھول جس طرح نکھرے سو کھنے سے شبنم کے

سیکڑوں قوس قزح جس طرح لہروں میں نہائیں

صبح کی وہ نغمگی جیسے تارے مل کے گائیں

آ گئی یادِ بہاری کی لچک رفتار میں — موج دریا کا تبسّم بس گیا رخسار میں

کاش کہ جھٹپٹے میں یوں ترا خیال دل پہ چھائے

جیسے جبین چرخ پر کوئی ستارہ مسکرائے

کہیں دامانِ بادِ صبح بھی آلودہ ہوتا ہے — بچا لیتا ہے حسن نرم خود دوشیزگی اپنی

جو ہونٹوں تک ترے محدود رہتی ہے سحر ہوتے
اُفق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے

ترے خیال کی رنگینیوں کا کیا کہنا
فضا میں جیسے گلابی سے کوئی چھلکا ئے

جہاں سے نقش مٹیں جیسے چھپتے سورج کے
مٹا گئیں مجھے یوں کم نگاہیاں تیری

یہ سر سے تا بقدم محویت کا عالم ہے
کہ گہرے سوچ میں جسطرح ڈوب جائے بدن

باغ جنت پہ گھٹا جیسے برس کے کھل جائے
سوندھی سوندھی تری خوشبوئے بدن کیا کہنا

جگمگاہٹ یہ جبیں کی ہے کہ پو پھٹتی ہے
مسکراہٹ ہے تری صبح چمن کیا کہنا

زلف شبگوں کی چمک پیکر سیمیں کی دمک
دیپ مالا ہے سر گنگ و جمن کیا کہنا

جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلوؤں کی
چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

تاروں کے قلوب جیسے دھڑکیں
رات آپ کی ادا ادا کو دیکھا

جیسے نشاط مسکرائے، جیسے صباح تھرتھرائے
جیسے حیات رسمائے، حسن کی تازگی تو دیکھ

جیسے پیام راز آئیں، شعلہ ساز تھرتھرائیں
جیسے ستارے ل کے گائیں حسن کی نغمگی تو دیکھ

جیسے سکون تھرتھرائے جیسے سکوت کچھ سنائے
جیسے سگندھ مسکرائے حسن کی طرفگی تو دیکھ

سفید پھول زمیں پر برس پڑیں جیسے — فضا میں کیف سحر ہے جدھر کو دیکھتے ہیں
پو پھوٹ رہی ہے زجبیں تا بہ کفِ پا — یا چادرِ شبنم میں جھلکتا ہے گلستاں
کسی کی آنکھ میں ملتے ہیں دونوں وقت فراق — ہم اک نگاہ میں شام و سحر کو دیکھتے ہیں
جو ہلکی چھاؤں میں نغموں کی پنکھڑی سی بنے — وہی سنا ہے ترے حسن کا نشیمن ہے
نگاہِ گوش کی پر کیف تشنگی کو نہ پوچھ — اک ادھ کھلی سی کلی، اُدھ سنا سا راگ ہے تو
تجھی سے ہی کہیں شعلہ بداماں چادرِ شبنم — جھلکتی ہے کہیں روئے سحر پر تازگی تیری

فراق کی شاعری پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں، ان میں سے چند ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہیں اور بعض وزن دار ہیں اور حقیقت پر مبنی۔ فراق کی ہوس پرستی کے سلسلے میں جو کچھ اور جس انداز سے کہا گیا ہے، اس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں یہ سب کچھ حسن و عشق کا محدود اور مروجہ تصور رکھنے اور اپنی رائے پر تعصب کے ساتھ اصرار کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی شاعری میں بعض مقامات پر فراق انتہا پسند ہو گئے ہیں اور اس فن کارانہ ضبط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے جس کے بغیر عنصری تجربے کو جمالیاتی تجربے میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے یہاں بعض جگہ لذتیت بھی حاوی ہو گئی ہے۔ لیکن ان کے بہترین نمائندہ اور منتخب اشعار میں ہمیں حسن و عشق کا ایک صحت مند اور جسم و روح کو آسودگی بخشنے والا تصور ملتا ہے اور جدید نفسیات نے انسانی جذبات و احساسات اور ان کی

قوتِ ارادی کا جو علم ہمیں دیا ہے۔ اس کے پیش نظر فراق پر اس قسم کے اعتراضات بہت سطحی معلوم ہوتے ہیں۔ صرف ایسے اشعار کو سامنے رکھ کر جو فن اور عروض کے کانٹے پر پورے نہ اُترتے ہوں فراق کی شاعری کی اہمیت اور عظمت سے انکار کرنا بھی نقطۂ نظرے محدود ہونے کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ آثر لکھنوی صاحب نے ایسا ہی کیا ہے۔ ان کی تنقید پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ شعر کی بڑائی کو صرف عروض کی صحت پر منحصر سمجھتے ہیں۔ فراق نے اپنے ایسے اشعار کے جواز میں ایک بار انگریزی شاعر پوپ کا یہ قول نقل کیا تھا کہ بعض اوقات تو ہومر بھی اونگھنے لگتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فراق کے یہاں اکثر خیالات پر الفاظ کی قبا راست نہیں آتی جس کی وجہ سے ان کی غزلوں میں ناہمواری آگئی ہے، اور ان کے اچھے اشعار بھی ترشے ہوئے ہیروں کی بجائے کچھ اکھڑے اکھڑے سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے خود یہ دلیل پیش کی ہے کہ وہ حقیقت کے ادراک کی ترجمانی جس منفرد انداز میں کرنا چاہتے ہیں اس کی معنویت اور لطافت کی زبان متحمل نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اپنے تخیل اور احساس کے اچھوتے پن پر زور دیا ہے اور اپنی ناہمواری کے عیب کو خوبی ثابت کرنے کے لئے انگریزی تنقید کا یہ قول پیش کیا ہے کہ:۔

"ایک واضح خیال ایک چھوٹا خیال ہوتا ہے۔" (A CLEAR IDEA IS A SMALL IDEA) اس ادعا کے پس منظر میں دراصل ایک نوع کی نارسائی

اور عاجزی کا اعتراف جھلک رہا ہے۔ آخر غالب اور اقبال نے بھی اسی حقیر زبان میں شاعری کی ہے اور گو غالب نے "تندیٔ صہبا" کے باعث آبگینے کے پگھل جانے اور اقبال نے حقیقت پر "جامۂ حرف" کی تنگی کی شکایت کی ہے۔ پھر بھی یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ ان دونوں کے یہاں ہمیں خیالات اور جذبات واحساسات کے مرکب اور اس کے خارجی پیکر میں مکمل مطابقت وہم آہنگی نظر آتی ہے۔ تاہم میری یہ رائے ہے کہ فراق کے یہاں مواد کی اہمیت زیادہ ہے کہ ہم ان کی فنی کوتاہیوں سے چشم پوشی کرنے میں حق بجانب کہے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ فراق کے یہاں یہ ناہمواری کچھ تو ان کے مزاج کے افتاد کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، اور کسی حد تک نئے خیالات کے اظہار کی خاطر خارجی وسیلے کو عام ڈگر سے ہٹ کر استعمال کرنے کی وجہ سے۔ اگر آثر لکھنوی صاحب کی بات کو صحیح بھی مان لیا جائے (اور میں ایک حد تک اسے صحیح مانتا بھی ہوں) تب بھی فراق کا اکھڑا اکھڑا پن اپنی معنوی دولت کی وجہ سے جگر اور مجاز کی میناکاری اور رومانوی سطحیت کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے فراق نے کئی جگہ اپنی شاعری کی قوتِ تبنفا کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہاں بھی بات ذرا بڑھا کر کہی گئی ہے۔ اس اصطلاح کا اطلاق صحیح معنوں میں ورڈز ورتھ کی شاعری پر کیا جا سکتا ہے۔ فراق کی شاعری حیاتی شاعری ہے جس میں بڑا کس بل، بڑی حلاوت، بڑی جذباتی آسودگی پائی جاتی ہے۔ اس کی خوبی اور بڑائی اس میں ہے

کہ جذبے کی تپش کے ساتھ فکر کی تابناکی سے بھی معمور ہے لیکن توتِ شفا کی اصطلاح جس ترفع، جس مسرت آمیز بصیرت، جس ذہنی اور اخلاقی قلب ماہیت کے عناصر کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس کے نقوش شاید فراق کی شاعری میں واضح طور سے نہیں ابھرتے اسی طرح فراق نے جگہ جگہ اپنی شاعری کو آفاقی کلچر کا جزو بھی بتایا ہے۔ یہ اصطلاح بھی بڑی بھاری بھرکم اور مرعوب کن ہے، اور فراق کی وضاحت کے باوجود بھی میں اسے ان کی شاعری پر منطبق کرنے میں تامل کروں گا۔ اس اصطلاح کے مفہوم میں جو ابدیت اور بے کراں کیفیت پائی جاتی ہے، اس کی حامل شیکسپیئر، گوئٹے، غالب اقبال اور ٹیگور کی شاعری ہی کہی جاسکتی ہے۔ فراق نے اپنی شاعری میں بہت سی جگہ اپنی استادی کے کرتب دکھائے ہیں جس کا نتیجہ وہ لمبی لمبی غزلیں ہیں جو اکثر گراں گزرتی ہیں۔ ان غزلوں کی طوالت اور قافیہ پیمائی ان کے مجموعی اور مرکزی تاثر کو ایک حد تک کمزور ہلکا کر دیتی ہے۔ انھیں پڑھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جس حس یا ادراکی بصیرت کو شاعر پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کی شعاعیں مختلف اشعار میں پھوٹ نکلی ہیں بلکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ خیال کی گرہوں کو کھولنے یا اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی بجائے صرف استادی کے بل بوتے پر اشعار کا انبار لگا دیا گیا ہے۔ فراق موسیقی کی اصطلاحوں کے بھی بڑے دلدادہ ہیں۔ اس شوق کا مظاہرہ ان کے تنقیدی مضامین میں بھی ملتا ہے۔ شاعری میں ان اصطلاحوں کے چکر میں پڑ کر بجائے

لطیف اور موثر موسیقی پیدا کرنے کے لئے وہ بھونڈی قسم کی جھنکار پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور یہ کوشش بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔

فراؔق نے ترقی پسند موضوعات پر نظمیں بھی لکھی ہیں، جو معنوی اور فنی اعتبار سے ان کی غزلوں کے مقابلے میں کم حیثیت ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل کے ذریعے ہی وہ اپنے سیاسی اور سماجی شعور کا بہترین طریقے پر اظہار کر سکتے ہیں۔ میری رائے میں غزل کی رمزیت اور ایمائیت میں اس کی بڑی حد تک گنجائش ہے کہ وہ شاعر کے سیاسی اور سماجی شعور کی عکاسی کر سکے۔ غزل میں تفصیل نہیں آسکتی منطقی تسلسل نہیں برقرار رکھا جا سکتا، وضاحت قطعیت اور پھیلاؤ کو نہیں پیش کیا جا سکتا، کیونکہ غزل کا آرٹ اشاروں کا آرٹ ہے۔ مکمل تصویر کی جگہ ہلکے اور گہرے رنگوں سے ایک تانا بانا (PATTERN) تیار کرنے کا آرٹ ہے لیکن ہمیشہ اور ہر موقعے پر بات کو کھول کر، تفصیل کے ساتھ اور براہ راست کہنا نہ ضروری ہوتا ہے اور نہ گوارا۔ بلکہ اس کے بجائے معنی خیزی کے ساتھ اور آڑے ترچھے خطوں کی مدد سے جو نقش گری کی جاتی ہے وہ زیادہ دلکش اور ادراک پر جلد اثر انداز ہوتی ہے۔ سردار جعفری نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں کہا ہے کہ جو لوگ بات کو ڈھکے چھپے اشاروں میں کہنے پر زور دیتے ہیں۔ وہ پایانِ کار ہیئت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہیئت پرستی رجعت پرستی کے مترادف ہے۔

یہاں ایک مغالطہ ذہنی پوشیدہ ہے ۔ یہ کہنا کہ غزل ہماری موجودہ پیچیدہ اور تنوع تہذیب کی تمام ضرورتوں کے لئے کافی ہے ، بڑی تنگ نظری ہے ، اور فن کی دنیا میں تجربے اور ارتقا کی اہمیت کے انکار کی وجہ سے ادبی جمود کی طرف لے جاتی ہے ، لیکن دوسری طرف یہ دعویٰ بھی کہ رمز و کنائے کے ذریعے حقیقت کی ترجمانی کرنا رجعت پرستی ہے ، خود فن کے لوازم سے غفلت پر دلالت کرتا ہے ۔ اینگلز نے اپنے ایک خط میں جو اس نے ۱۸۸۸ء میں MARGARET HASKNESS کے نام لکھا تھا ، کہا ہے کہ ناول نگار جس حد تک اپنے سیاسی عقیدوں کو چھپانے میں کامیاب ہو اتنا ہی اچھا ہے اور یہ کہ بالزاک اپنی رجعت پرستی کے باوجود جمہوریت پسند زولا کے مقابلے میں برتر اور قابل ترجیح ہے ۔ جو بات ناول نگار کے متعلق کہی جا سکتی ہے وہی شاعر کے سلسلے میں کہی جا سکتی ہے ۔ خطابت اور نعرہ بازی اور شاعری کے درمیان حدِ فاصل قائم کی جا سکتی ہے ۔ دراصل ہر ادبی کارنامہ اشیا اور حقائق میں فن کار کی بصیرت کا ایک پیچیدہ مرکب ہوتا ہے اور اس میں ایک واضح اور کھلا ہوا حل تلاش کرنا غلطی ہے ۔ (PLEKHUOV.) نے گورکی کے ناول "ماں" پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں ۔ نظم اور غزل کے آداب مختلف ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ سچا اور صحت مند ادب ہم عصری زندگی کے ترقی پسند میلانات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے ۔ غزل گو شاعر کی غایت اور

اس کے مفہوم کا اندازہ ہم اس کی پیکر نگاری، اس کے لب و لہجے، اس کی رمزیت، غزل کی فضا اور اس کے مجموعی تاثر سے لگا سکتے ہیں اور غزل کو اس کی پوری ذہنی زندگی کے چوکھٹے میں پیوست کر کے اس کے متعلق نتائج اخذ کر سکتے اور ان پر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس امر کا قوی ثبوت کہ غزل کی اشارتی زبان میں بھی شاعر اپنے سیاسی اور سماجی شعور کا انتہائی فن کارانہ انداز میں اظہار کر سکتا ہے، جذبی کی وہ غزلیں ہیں جو فروزاں کے پہلے ایڈیشن کے بعد لکھی گئی ہیں۔ فراق اگر چاہیں تو اپنی غزل میں بھی ان تمام افکار اور میلانات کو اجاگر کر سکتے ہیں، جنھیں انھوں نے اپنی ترقی پسند شاعری کا موضوع قرار دیا ہے، اور انھیں یہی کرنا چاہیے۔

فراق ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کے ایک ممتاز نمائندہ ہیں۔ ان کی پر گوئی اور ان کا وفور ان کی خلاّقی کی دلیل ہیں۔ ان کے تخیل میں جو نزاکت اور شادابی، ان کے فکر میں جو گہرائی اور ہمہ گیری، اور ان کی جذباتی کائنات میں جو پختگی اور فراوانی ہے وہ ان کے معاصرین کے یہاں نظر نہیں آتی۔ ان کی فنی خامیاں، ان کی قوت اور کمزوری دونوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کو جو قدریں دی ہیں، وہ نئی اور اہم ہیں۔ اور اس طرح سے انھوں نے اردو غزل کا رُخ موڑ دیا ہے۔ اس بنیاد پر اگر انھیں جدید اردو غزل میں ایک بڑی اور موثر طاقت مان لیا جائے تو شاید کچھ بے جا نہ ہو گا۔

پروفیسر محمد حسن عسکری

کلام فراقؔ کی کچھ جھلکیاں

فراقؔ صاحب کی شاعری پر مفصل تبصرہ کرنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ یہ شاعری اس قسم کی چیز نہیں کہ ریل کے سفر میں کتاب ساتھ لیتے گئے اور گھر پہنچ کے مضمون لکھ دیا۔ اوّل تو غزل جیسی صنف سخن جس کی روایت اور نشو و نما سے واقفیت حاصل کرنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے جہاں اسالیب بیان بلکہ موضوعات تک مقرر سے ہوں وہاں یہ پتہ چلانا کہ کس شاعر نے روایت میں کس چیز کا اضافہ کیا، یہ ایسا اعجاز ہے جو اردو میں ابھی تک تو صرف ایک دفعہ ظہور میں آیا ہے ــــ فراقؔ صاحب کی تنقید میں۔ پھر یہاں ایک ایسی شاعری سے واسطہ ہے جسے پختگی تک پہنچنے میں بیس سال لگے ہیں، جس کے پیچھے ایک عمر کے تجربات ہیں، صرف غم جاناں ہی کے نہیں بلکہ غم دوراں کے بھی۔ مجھے یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں، میں جانتا ہوں کہ بڑا شاعر کوزے میں دریا بند کرتا ہے، ایک آدمی کے زندگی کے بیس سال چھوڑ

ساری انسانیت کی مجموعی اور ہزاروں سال کی زندگی کے تجربات کو ایک لمحے میں ہمارے لئے حقیقی بنا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اصرار ہے کہ بڑے شاعر کی انفرادیت کو گرفت میں لانے کے لئے کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ میں صاحب نظر نقادوں کے وجود سے منکر نہیں، مگر اس کو کیا کروں کہ میں صاحب نظر ہستیوں کی سرزمین میں پیدا ہی نہیں ہوا، کچھ پورب کی طرف رہ گیا۔ چنانچہ اس دفعہ بھی میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ میں نے فراق صاحب کی شاعری کی مخصوص انفرادیت کو سمجھ لیا ہے یا اُسے نثر کے لفظوں میں پیش کر سکا ہوں۔ کچھ بکھرے بکھرے سے تاثرات پھر حاضر ہیں۔

فراق صاحب نے اردو شاعری کو ایک بالکل نیا عاشق دیا ہے اور اسی طرح بالکل نیا معشوق بھی۔ اس نئے عاشق کی ایک بڑی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر ایک ایسا وقار پایا جاتا ہے جو اردو شاعری میں پہلے نظر نہیں آتا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اردو شاعری میں عاشق کی ذہنیت ہمیشہ پست رہی ہے، حالانکہ اس میں بھی شک نہیں کہ بعض شاعروں کے یہاں ایسی پستی ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ مثلاً فانی کا یہ شعر جو مجھے ٹھیک طرح یاد بھی نہیں۔

مآل سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ　　بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

یہ شعر میں نے پہلے پہل سات اٹھ سال کی عمر میں ایک ہم جماعت کی زبان
سے سنا تھا بلکہ اکثر سنتا رہتا تھا، خیر یوں تو مجھے اب بھی کیا شعور ہے۔ مگر کم سے کم
اس زمانے کی بہ نسبت اب دو ایک باتیں تو زیادہ ہی جانتا ہوں۔ لیکن اُس زمانے میں
میں بھی مجھے یہ شعر سن کر شرم آجاتی تھی اور میری نگاہیں یوں جھک جاتی تھیں جیسے
کوئی میرے سامنے ننگا ہو گیا ہو۔ گندی سے گندی گالیوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں
ہوتا تھا مگر یہ شعر سن کر میں ہمیشہ یہ سوچنے لگتا تھا کہ ایسے لفظ میرے اس ہم جماعت
کے منھ سے کس طرح نکل سکے۔ فانی کی شاعری سے میری یہ کراہیت میرے دل میں اس
طرح بیٹھی ہے کہ باوجود کوشش کے میں فانی کا کلام نہیں پڑھ سکا۔ خیر میری ذاتی سوانح
عمری فی الحال اتنی اہم نہیں کہ جتنا اردو شاعری میں عاشق کی ذہنیت کا سوال،
غالبؔ کے یہاں وقار بہت وافر ہے مگر اس وقار کا تجزیہ فروری ۱۹۴۷ء کے "ساقی"
میں آفتاب احمد صاحب خوب کر چکے ہیں۔ بدقسمتی سے انھوں نے بیچ میں کہیں فرار
ذکر بھی کر دیا ہے اس لئے میرا بیان "حاجی بگویم" کا ضمیمہ معلوم ہوگا۔ مگر غالبؔ کی
تنقیدیات میں یہ ایسا بیش قیمت اضافہ ہے کہ آئندہ غالبؔ کا نقاد دیانت داری
کے ساتھ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایسی حساس تنقید اردو میں روز روز

نہیں ملتی ..... تو غالب کے یہاں عاشق کو اپنی ہستی اور خصوصاً اپنی ذہانت اور انفرادیت
کا احساس اتنی شدت کے ساتھ ہے کہ معاملہ وقار سے کچھ آگے جا پہنچتا ہے چاہے
آفتاب احمد صاحب کی طرح ہم اسے ذہنی بیماری نہ کہیں۔ بعض وقت تو یہ احساس
مشیخت ورنہ کم سے کم تکبّر سے ملنے لگتا ہے۔ بلکہ بعض شعروں میں تو محبوب کی حیثیت
بھی فروعی رہ جاتی ہے۔ گویا محبوب کی ضرورت صرف اتنی ہے کہ وہ عاشق کے
اعصاب میں ارتعاش پیدا کر دے۔ دیکھیے اس شعر میں غالب نے محبوب کو کیا
صاف پرے بٹھایا ہے:۔

روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے — نہیں نگار کو الفت نہ ہو، نگار تو ہے

ایک اور شعر میں تو غالب نے "تکلف برطرف کر کے صاف صاف بات کہہ
ہی ڈالی ہے:۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

بغیر کسی لیپ پوت کے غالب صاف کہہ رہے ہیں، اور بڑے بڑے خوش ہو ہو
کے "ہم بھی کیا لوگ ہیں!" یہاں یہ لفظ جنوں بھی غور کے قابل ہے یہاں اس کے معنی

روایتی عشق اور دیوانگی کے نہیں ہیں ۔ بلکہ اس کا اشارہ غالب کی اپنی شخصیت اور انفرادیت کی طرف ہے اور پھر دوسرے لفظ "انداز" میں بڑی شوخی کے ساتھ اپنی ہستی پہ ناز کیا ہے یعنی غالب کی نادر اور منفرد شخصیت کو اظہار چاہیے خواہ اس کا انداز کچھ بھی ہو عاشقی یا تقتیل کے خلاف جہاد۔ غالب کا محبوب اگر ذرا بھی حساس ہوگا تو یہ "انداز جنوں" والا فقرہ سننے کے بعد اس کے دل میں پھر کسی عاشق کی تمنا تو باقی نہ رہی ہوگی کم سے کم وہ عشق کے نام سے ڈرنے ضرور لگا ہوگا۔ خیر اس ضمن میں غالب کے دو ایک شعر پھر سے پڑھ لیجیے۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وہ ایک شعر ہے نا :-

غالب ان سیمیں تنوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

غالب کی بہت سی عشقیہ شاعری اس تجویز پر غالب کی لبیک ہے ۔

"بندے کی خدمات حاضر ہیں"۔

میر کے یہاں سپردگی بہت زیادہ ہے، لیکن وقار بھی ہاتھ سے نہیں جانے پاتا مگر یہ وقار فراق صاحب کے وقار سے ذرا مختلف چیز ہے۔ یہ فرق ظاہر کرنے کی کوشش بھی میں کروں گا پہلے میر کے دو ایک شعر سناتا ہوں۔

میر کو تم عبث اُداس کیا ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا ہم فقیروں سے کج ادائی کی
یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں

ابھی میں نے کہا تھا کہ غالب کو اپنے دماغ پر ناز ہے۔ اگر آپ مصر ہیں تو میں یہ مانے لیتا ہوں کہ غالب اس شخصیت پر نازاں ہیں جو شعور اور غیر شعور دونوں سے مل کر بنی ہے مگر غالب کا دماغ اس شخصیت کی ندرت کا بے طرح قائل ہے، اور اس کا یہ علم ہی اسے عشق اور زندگی کی معراج پر نہیں پہنچنے دیتا۔ میر ایک ایسی دنیا میں بستے ہیں جہاں قدر اولیں انسانیت ہے۔ جہاں ذہانت اور کوڑھ مغزی کا سوال ہی غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ میر کے عاشق کے متعلق ہم یہ معلوم نہیں کرنا چاہتے کہ وہ فلسفی تھا یا بدھو نفر۔ یہ عاشق محبوب سے محبت کا طالب نہیں، بس اتنا چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ انسانوں جیسا برتاؤ کیا جائے اس کے عالم و فاضل ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ محض انسان ہونے

کی وجہ سے ۔

ہم اک ناامیدانہ کرتے نگاہ	مگر تم تو منہ بھی چھپا کر چلے

میر کا عاشق ذہانت کی سطح سے بات ہی نہیں کرتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کے اندر ذہانت ہے ہی نہیں۔ وہ انسان اس قدر ہے کہ ذہانت لازمی چیز نہیں رہتی چنانچہ اس کا وقار ایک خوددار انسان کا وقار ہے۔ فراق صاحب کے یہاں بھی یہ انسانی وقار موجود ہے۔ ان کی انسانیت میں غالباً میر کی سی حلاوت تو نہیں ہے مگر ان کے عاشق میں ذہانت کا عنصر پوری طرح موجود ہے۔ خیر فراق صاحب پر تو ہمیں بحث کرنا ہی ہے۔ پہلے ذرا ایک اور شاعر کو دیکھتے چلیں۔ اردو کی معاملہ بندی والی شاعری اپنی حدوں کے اندر بڑی اچھی شاعری ہے مگر وہ بڑی شاعری نہیں بن سکتی کیونکہ اس میں تخصیص اتنی ہوتی ہے کہ تعمیم نہیں پیدا ہونے پاتی۔ اس شاعری میں کسی نفسیاتی واقعے کو اس طرح نفظوں میں گھیرا جاتا ہے کہ آفاقیت باہر ہی رہ جاتی ہے۔ حسرت موہانی کی بہت سی ایسی شاعری میں جو محض معاملہ بندی نہیں ہے۔ اس قسم کا ایک پہلو موجود ہے لیکن حسرت کی اس شاعری میں بھی ایسی تعمیم، ایسی آفاقیت ایسی جذباتی وسعت یا جذباتی توسیع موجود ہے جو اسے خالص معاملہ بندی کی

پابندیوں اور معذوریوں سے بچالے جاتی ہے۔ مگر اس آفاقی شاعری میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں جو ایک خاص ماحول، ایک خاص معاشرت اور ایک خاص سماجی طبقے کی یاد دلاتے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ حسرت کی خامی ہے۔ مجھے صرف ایک خصوصیت کا ذکر مقصود ہے۔ حسرت کے عاشق میں بھی انسانی وقار موجود ہے، اور خودداری بھی۔ لیکن حسرت کے یہاں انسانیت وہ بنیادی حیثیت نہیں رکھتی جو میر کی شاعری میں اسے حاصل ہے۔ حسرت کے عاشق کو سمجھنے میں وہ مقامی رنگ مدد دے گا جس کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے۔ حسرت کے عاشق اور معشوق دونوں ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، دونوں کا سماجی درجہ بالکل ایک جیسا ہے غالباً دونوں میں کچھ قرابت بھی ہے دونوں کو اپنی جسمانی خواہشات کا احساس ہے، نہ تو عاشق محبوب پر کوئی عنایت کر رہا ہے نہ محبوب کو خواہ مخواہ عنایت کرتے ہوئے اکڑنا چاہئے تھوڑے بہت غمزوں میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ جانوروں تک کی مادائیں اپنے آپ کو سپرد کرتی ہیں تو بہت بن بن کے۔ غرضیکہ یہ محبت یک طرفہ نہیں، بلکہ اس میں دونوں برابر کے شریک ہیں ؎

جبکہ یہ سب کچھ ہوا تھا آپ کی امداد سے　　ہم کو تنہا کیوں ملے جورِ محبت کی سزا

خفگی کا حق صرف محبوب ہی کو حاصل نہیں ، عاشق کا بھی جی چاہے تو ناراض

ہوسکتا ہے :۔

خفا ہم ان سے خود رہتے تھے اک دن وہ بھی تھے حسرتؔ

وہ ہم سے بے سبب روٹھے ہیں یہ بھی اک زمانہ ہے

یہ غور کیجئے کہ یہاں وہ "انداز جنوں" والی خود پرستی غائب ہے ۔ نہ حسرتؔ کا محبوب سخت دل یا عاشق کا دشمن ہے اس کا روٹھنا اور منانا سب وہ جنسی کھیل ہے جو ساری فطرت میں نظر آتا ہے ، مادہ کا مقصد بھی سپردگی ہوتا ہے مگر اس سے پہلے وہ بیسیوں بہلاوے دیتی ہے ۔ اور اس راز سے نر بھی بے خبر نہیں ہوتا چنانچہ حسرتؔ نے خود ہی کہہ دیا ہے :

مجھ سے بیکار وہ ظاہر میں خفا ہیں حسرتؔ

جب میں چاہوں گا مناؤں گا یہ دعویٰ ہے مجھے

حسرتؔ کے یہاں محبت کی پیچیدگیاں حیاتیات کے قانونوں سے پیدا ہوتی ہیں ، انسان کے دماغ سے نہیں ۔ چنانچہ ان کے عاشق کا وقار ایک تندرست نر کا وقار ہے ، ایک ایسے آدمی کا وقار ہے جو سماجی اعتبار سے اپنے محبوب کا ہم پلہ

ہے ، جسے اپنی جنیست بھی ایک مستقل چیز نظر آتی ہے اور جس پر اُسے تھوڑا بہت ناز بھی ہے کیونکہ اُسے معلوم کہ محبوب کا دل بھی عاشق کی جنیست کا طالب ہے ۔

اب نہ دیکھیں گے تیری راہ کہ ہم — رہ چکے ہیں خراب و خوار بہت
حالِ دل کم کہا کرو حسرتؔ — ان کو ہوتا ہے ناگوار بہت
جرمِ نظارہ پہ کون اتنی خوشامد کرتا — اب بھی وہ روٹھے ہیں لو اور تماشا دیکھو
دو ہی دن میں وہ مروت ہے نہ وہ چاہ نہ پیار — ہم نے پہلے ہی یہ تم سے نہ کہا تھا دیکھو
مر مٹا آپ پہ کون آپ نے یہ بھی نہ سُنا — آپ کی جان سے دور آپ سے شکوہ ہے مجھے

اس آخری شعر کا مقابلہ غالبؔ کے اس شعر سے کیجئے تو فرق بالکل صاف ظاہر ہو جائے گا۔

تماشہ کر اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

مجھے تسلیم ہے کہ اس شعر میں زور" ہم "، "یہ نہیں" تمنا " پر ہے ، لیکن عاشق اپنی جذباتی شدت کا صلہ وصل کی شکل میں نہیں مانگ رہا ، اُسے وصل کی آرزو تو ضرور ہے لیکن اس سے اہم بات یہ ہے کہ محبوب اس کی شخصیت کے امکانات کا تماشا کرے اس کے برخلاف حسرتؔ کے شعر میں" کون " بالکل اسی

قسم کا عاشق ہے جس کا بیان میں اُوپر کر چکا ہوں ، یا ایک اوسط درجے کا شہوانی انسان اگر اس شعر میں تھوڑی بہت اکڑ موجود ہے تو یہ کسی بے مثال شخصیت کی اکڑ فوں نہیں ہے بلکہ تندرست جسم کی تندرست خواہشوں پر ناز ہے۔ تو یہ ہے حسرت موہانی کے عاشق کا وقار۔ مگر حسرت موہانی کی شاعری میں عقلی اور ذہنی عنصر کی کمی ہے۔ یہ کمی میر کی شاعری کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتی ، کیونکہ وہاں انسانیت کو ایک ایسی بنیادی حیثیت حاصل ہے جو اس عقلی عنصر کا نعم البدل بن جاتی ہے مگر حسرت موہانی کے زیادہ تر اچھے اشعار میں بھی یہ بات اتنی شدت کے ساتھ نہیں پیدا ہونے پاتی۔ یوں ہونے کو اس قسم کے اشعار بھی ملیں گے جیسے یہ :-

آپ نے کیا کیا کہ حسرت سے ۔۔۔ نہ ملے حسن کا غرور کیا

عشق بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے ۔۔۔ آخر یہ میں نے اپنا کیا حال کر لیا ہے

حسرت کی اچھی شاعری اتنی کامیاب شاعری ہے کہ وہ عموماً ہمارے ذہن کو یہ نہیں سوچنے دیتی کہ ہم شاعری سے کئی اور باتوں کا بھی مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اگر حسرت کے عاشق کے پاس دماغ اور ہوتا تو ان کی شاعری اس سے بھی بڑی چیز بن سکتی تھی۔

خیر اب اصل مسئلے کی طرف لوٹئے یعنی میرا یہ بیان کہ فراؔق صاحب کے عاشق میں ایک ایسا وقار پایا جاتا ہے جو اردو شاعری میں ایک اضافہ ہے، فراؔق کے یہاں انسانیت وہی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اسی پائے کی ہے جیسی میرؔ کے یہاں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری میں ذہانت بھی اس بلا کی ہے کہ اردو کے کسی اور شاعر سے دب کے نہیں رہتی۔ چاہے زیادہ ہی ہو۔ چنانچہ اُن کے عاشق میں ایک طرف تو خوددار انسان کا وقار ہے دوسری طرف ذہین انسان کا وقار ہے۔ فراؔق کے یہاں اپنی ذہانت کا احساس بے جا فخر و ناز میں کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ یہ ذہانت محبوب پر رعب ڈالنے کے لئے استعمال نہیں ہوتی، بلکہ اپنے آپ کو ابتذال سے بچانے کے لئے۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ محبت کسی قسم کی ذہنی پستی نہیں ہے بلکہ اگر محبوب کوئی حساس اور ذہین انسان ہے تو وہ بھی عاشق کی جذباتی گراوٹ کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھے گا۔

فراؔق کی شاعری میں یہ اعتراف موجود ہے کہ محبت بنیادی اعتبار سے ایک جسمانی خواہش ہے، مگر پھر بھی ان کے یہاں زیادہ زور نفسیاتی یا روحانی پہلو پر رہی ہے محبت کی جسمانی اصل پر ضرورت سے زیادہ توجہ صرف کرنے یا اس

کے علاوہ پس منظر میں کسی اور اصول یا حقیقت کا خیال نہ رکھنے سے (خواہ یہ سب بڑی معصومیت کے ساتھ کیا گیا ہو) محبت ایک واقعہ بن کر رہ جاتی ہے جس کا زندگی کے دوسرے تجربوں سے کوئی گہرا نامیاتی تعلق باقی نہیں رہتا۔ مثلاً حسرت موہانی کے یہاں یہ دو شعر بھی ملتے ہیں :۔

نہ سہی گر انھیں خیال نہیں   کہ ہمارا بھی اب وہ حال نہیں

شوق ان کا سو مٹ چکا حسرت   کیا کریں ہم اگر وفا نہ کریں

محبت کا جسمانی پہلو کتنا ہی اہم ہو، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اور جانداروں کے برخلاف انسان کے اندر محبت ایک دماغی فعل ہے۔ انسان کے لئے صرف جسمانی تسکین ہی نہیں بلکہ نفسیاتی عمل بھی بہت روحانی اہمیت رکھتا ہے، مجھے اس سے انکار نہیں کہ حسرت موہانی کے یہاں بھی عشق کے نفسیاتی عمل کو بہت کافی اہمیت حاصل ہے، لیکن ان کے عاشق اور معشوق دونوں سب سے پہلے اور سب سے آخر میں دو ایسے جسم ہیں جنھیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ فراق کے عاشق اور معشوق کے پاس جسم تو خیر ہے ہی، لیکن دماغ بھی ہے اور بڑے مصرف قسم کا، اور جیسے عشق کے علاوہ اور بھی مصروفیتیں ہیں اس لئے ان دونوں کے

تعلقات ہیں اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہاں صرف دو جسم ہی ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں ہیں بلکہ دو دماغ بھی گتھے ہوئے ہیں۔ انھیں دو دماغوں کے داؤ پیچ سے فراق کی شاعری تشکیل پاتی ہے اس عاشق میں نہ تو اینٹھ اکڑ ہے نہ محبوب کی طرف سے خود پرستانہ بے پروائی ہے جہاں عاشق اپنی ذہانت اور اپنے دماغ کا احترام کرتا ہے وہاں محبوب کے دماغ کا بھی قائل ہے۔ محبت میں جبلت تو خیر اپنا کام کر ہی رہی ہے مگر وہ دماغوں کو بھی معطل نہیں کرنا چاہتا بلکہ بعض جگہ تو دماغ اتنا کام کرتا ہے کہ روایتی تغزل کے عادی تو یہ سمجھیں گے عشق نہیں ہو رہا ہے کاروباری باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک طرح دیکھئے اکثر جگہ واقعی ہوتا بھی ہے ایک قسم کا نفسیاتی مول تول یعنی عاشق یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہے کہ کس حد تک اس کا دبنا ایک خوددار کے لئے جائز ہو سکتا ہے۔ فراق کے عاشق کو آپ اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکیں گے جب تک کہ فراق کے محبوب کو بھی نہ سمجھ لیں۔ فراق صاحب نے محبوب کو ایک ایسی معروضی حیثیت دے دی ہے جو اردو شاعری میں اُسے حاصل نہیں تھی۔ ایک طرح لکھنؤ اسکول کی شاعری میں محبوب معروضی حیثیت رکھتا بھی ہے لیکن یہ معروضیت نفسیاتی نہیں ہے، کنگھی، چوٹی، انگیا اور جوبن کی ہے، اردو کی داخلی شاعری میں

محبوب صرف عاشق کا ضمیمہ رہا ہے۔ محبوب یا تو جمالیاتی دلکشی کی وجہ سے اہم بنتا ہے یا پھر اس کی ہستی پر صرف اس حد تک غور کیا جاتا ہے جہاں تک کہ وہ عاشق کی روحانی نشوونما کا باعث بنا ہے یا اس کی وجہ سے عاشق کے اندر داخلی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ یہ دونوں باتیں فراقؔ کے یہاں بھی موجود ہیں۔ لیکن انھوں نے محبوب کو عاشق کی ہستی سے الگ کر کے بھی دیکھا ہے۔ ان کا محبوب صرف ایک ٹائپ نہیں بلکہ ایک کردار ہے اور اس کردار کی نفسیات بھی سیدھی سادی نہیں ہے ایسی ہی پیچ در پیچ ہے جیسی عاشق کی نفسیات :۔

ترے جمال کی تنہائیوں کا دھیان نہ تھا — میں سوچتا تھا مرا کوئی غم گسار نہیں

یہ عاشق اور معشوق دو نفسیاتی نظام ہیں جن میں ٹکر ہو رہی ہے۔ یہاں سوال محبوب کے مہربان ہونے یا ستم کرنے کا نہیں ہے، بلکہ ان دو نظاموں کو ہم آہنگ کرنے کا، ان دونوں کے مطالبات کو اس طرح پورا کرنے کا کہ دونوں کی تسکین بھی ہو جائے اور خسارہ بھی نہ اٹھانا پڑے :۔

عشق میں سچ ہی کا رونا ہے — جھوٹے نہیں تم جھوٹے نہیں ہم

یہاں اگر عاشق روٹھتا ہے تو اپنے "انداز جنوں" دکھانے کی وجہ سے

نہیں، نہ یہ وہ حیا تیاتی آنکھ مچولی ہے جو حسرت موہانی کے یہاں ملتی ہے۔ اُس کے ذہنی اور جذباتی آتار چڑھاؤ میں خود آگاہی کو بہت دخل ہے، اور محبوب کی نفسیات سے آگاہی کو بھی بہت دخل ہے۔

پھر عشق نہ روٹھ سکے گا　　　آج منالے آج منالے

فراق صاحب کی عشقیہ شاعری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا محرک ضرور عشق ہے، مگر یہ شاعری صرف عشق نے نہیں کی، بلکہ شاعر کے پورے شعور نے کی ہے۔ فراق نے عشق کو شعور اور زندگی کے دوسرے تجربات سے الگ کرکے نہیں دیکھا، بلکہ عشق کو پوری زندگی کے گرد و پیش میں رکھ کر۔ اُن کے یہاں عشق بہت سے ذہنی تجربوں میں سے ایک تجربہ ہے ـــــ دوسروں سے نمایاں اور اہم۔ چنانچہ ان کے اشعار پڑھنے والے کے صرف ایک تجربے (عشق) سے تخاطب نہیں کرتے بلکہ اس کے پورے شعور سے اسی چیز کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں جذبہ اور خیال ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے، ان کے شعور میں یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری اتنی تہ دار ہے کہ فراق صاحب کبھی عوام میں مقبول نہیں ہو سکتے۔ یہ شاعری ابہام اور فصاحت دونوں

کا امتزاج ہے۔ جو تجربات اس شاعری کا موضوع ہیں وہ تو حد درجے کے نرم و نازک اور لطیف ہیں، لیکن فراق صاحب ہر کیفیت کے اختصاص اور اُس کی انفرادی صفت اس طرح گرفت میں لائے ہیں کہ ان کی تصویر کی لکیریں ہر جگہ صاف اور روشن ہیں اور بڑی مضبوط۔ لیکن اس "سختی" کے باوجود ان کے اشعار میں ایسی کیفیتوں کا بیان ہے" جو بھولتی بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں"۔ اُن کی شاعری ایسی دنیاؤں میں سانس لیتی ہے جو کچھ سمجھ میں آتی ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتیں کم سے کم ان کا بیان کبھی مکمل طور سے نہیں ہو سکتا ہے۔ ان کی شاعری آہٹوں کی شاعری ہے ـــــ کہیں محبوب کی آہٹ ہے کہیں کائنات کی، کہیں خود ان کی ذہنی کیفیتوں کی۔ اُن کے اشعار پڑھتے ہوئے دماغ کو ایک ہلکا سا دھچکا لگتا ہے۔ مگر اس کا باعث بڑی مدھم اور ملائم کیفیتیں ہوتی ہیں۔ نیاز فتح پوری نے فراق صاحب کے متعلق ایک بڑی بصیرت افروز بات کہی ہے: "وہ شعر نہیں کہتے زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتے ہیں ..... اتنا لطیف اور عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علیحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔" ان کے اشعار دماغ میں ایک خاص جھجھن جھناہٹ، ایک آواز بازگشت سی چھوڑ جاتے ہیں جو دماغ پر اتنی

مسلط ہو جاتی ہے کہ ازلی اور ابدی زندگی کی گونج معلوم ہوتے لگتی ہے میرا خیال ہے کہ فراق صاحب کی شاعری اتنی ان کی آواز میں نہیں جتنی اس جھن جھناہٹ میں ہے۔

فراق صاحب کی شاعری میں دھنک کے ساتوں رنگ موجود سہی لیکن ان کے ساتھ ہی وہ خشکی بھی ملتی ہے جو کم سے کم میرے نزدیک بڑی شاعری کے لئے بہت ضروری ہے۔ کیونکہ بڑی شاعری شاعرانہ نہیں ہوتی، وہ چیزوں کی ماہیئت سے براہ راست متعلق ہوتی ہے۔ بڑی شاعری، شاعری بننے کی کوشش سے شروع نہیں ہوتی، بلکہ بے نام چیزوں کے ناموں کی تلاش سے۔ اسی لئے بڑی شاعری کے لئے معروضیت انفصال اور یہ "خشکی" ضروری ہے۔

فراق صاحب کی شاعری میں عالم گیریت اور آفاقیت کا ذکر ان کے ہر نقاد نے کیا ہے لیکن اس پر ابھی تک توجہ نہیں کی گئی کہ ان کے اشعار کے موضوع اور معنی سے قطع نظر آفاقیت کا احساس پیدا کرنے میں ان کے لفظوں کی آواز کا بہت بڑا حصہ ہے خصوصاً (VOWEL SOUNDS) سے فراق نے جو فائدہ اٹھایا ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر نے مشکل ہی سے اٹھایا ہوگا کہیں

کہیں تو خیر غالبؔ نے بھی اعجاز کر دکھایا ہے۔ مثلاً

تو اور آرائش خم کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

شعر کے مفہوم میں تخصیص سے تعمیم پیدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح پہلے مصرع کی آوازیں تخصیص کی نمائندگی کر رہی ہیں، اور دوسرے مصرع کی آوازیں توسیع کا اثر پیدا کرتی ہیں۔ لیکن فراقؔ صاحب کے یہاں یہ معجزہ ہر ہر قدم پر ملتا ہے۔ اگر اُن کے اشعار میں کائنات کی خاموشیاں گونج رہی ہیں تو اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے (VOWELS) لامحدود وسعتوں کی یاد دلاتے ہیں۔

جن لوگوں نے فراقؔ صاحب کو اپنے اشعار خود پڑھتے ہوئے سنا ہے وہ اس کا اندازہ بڑی آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ بلکہ اس دفعہ میں ایک اور جراُت بھی کروں گا، پہلے کبھی میں نے کہا تھا کہ فی الحال جتنے شاعر اور نقاد اردو میں شعر یا تنقید لکھ رہے ہیں۔ ان میں صرف فراقؔ صاحب ہیں جنھیں پائندگی حاصل ہو سکے گی اس مرتبہ یہ بھی دعویٰ کروں گا کہ آج کل صرف فراقؔ صاحب ہی ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے شعر پڑھنا جانتے ہیں اور جو اپنے پڑھنے کے انداز سے اپنے شعر کی معنویت کو زیادہ واضح کر سکتے ہیں۔ اور شاعروں کے منہ سے ان کا کلام سننا چنداں ضروری

نہیں۔ اس کے بعد بھی آپ ان کی شاعری سے نفرت کر سکتے ہیں۔ لیکن فراقؔ کی شاعری ہی یہ نہیں۔ فراقؔ کی آواز میں بھی کائنات جاگ اٹھتی ہے، خیر آخر میں فراقؔ صاحب کے دو چار شعر سن لیجئے۔

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا　　خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ابھی سنبھلے رہو کہ دن ہے فراقؔ　　رات پھر بے قرار ہو لینا

کوئے جاناں کے بھی اک مدت سے ہیں آہٹ پہ کان
اہلِ غم کے کارواں کن وادیوں میں کھو گئے

حسن سرتاپا تمنا، عشق سرتاپا غرور　　اس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں

وہ نہ آئیں گے تو فراقؔ نہیں　　کام ہی کیا ہے انتظار کریں

یوں تو اپنی رام کہانی کہہ کے فراقؔ نہ روتا تھا
آنکھیں جس سے بھر آئی تھیں نام ترا آیا ہوگا

کس لئے کم نہیں ہے دردِ فراق اب تو وہ دھیان سے اُتر بھی گئے

تمہیں کیا دل مضطر اُداس کتنا تھا
کہ آج تو نگہ ناز نے بھی سمجھایا

مائل بے داد وہ کب تھا فراق تو نے اس کو غور سے دیکھا نہیں

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے ‏ ‏ اک شرح حیات ہو گئی ہے

جب دل کی وفات ہو گئی ہے ‏ ‏ ہر چیز کی رات ہو گئی ہے

غم سے چھٹ کر یہ غم ہے مجھ کو ‏ ‏ کیوں غم سے نجات ہو گئی ہے

مدت سے خبر ملی نہ دل کی ‏ ‏ شاید کوئی بات ہو گئی ہے

جس شے پہ نظر پڑی ہے تیری ‏ ‏ تصویر حیات ہو گئی ہے

اب ہو مجھے دیکھئے کہاں صبح ‏ ‏ ان زلفوں میں رات ہو گئی ہے

دل میں تجھ سے تھی جو شکایت ‏ ‏ اب غم کے نکات ہو گئی ہے

اقرار گناہِ عشق سن لو ‏ ‏ مجھ سے اک بات ہو گئی ہے

جو چیز بھی مجھ کو ہاتھ آئی ‏ ‏ تیری سوغات ہو گئی ہے

کیا جانئے موت پہلے کیا تھی ‏ ‏ اب مری حیات ہو گئی ہے

گھٹتے گھٹتے تری عنایت ‏ ‏ میری اوقات ہو گئی ہے

اس چشم سیہ کی یاد یکسر　　شامِ ظلمات ہو گئی ہے
اس دور میں زندگی بشر کی　　بیمار کی رات ہو گئی ہے
جیتی ہوئی بازیٔ محبت　　کھیلا ہوں تو مات ہو گئی ہے
مٹنے لگیں زندگی کی قدریں　　جب غم سے نجات ہو گئی ہے
وہ چاہیں تو وقت بھی بدل جائے　　جب آئے ہیں رات ہو گئی ہے
دنیا ہے کتنی بے ٹھکانہ　　عاشق کی برات ہو گئی ہے
پہلے وہ نگاہ اک کرن تھی　　اب برقِ صفات ہو گئی ہے
جس چیز کو چھو دیا ہے تو نے　　اک برگِ نبات ہو گئی ہے
اکّا دُکّا صدائے زنجیر　　زنداں میں رات ہو گئی ہے

ایک ایک صفت فراقؔ اُس کی
دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

یہ سُرمئی فضاؤں کی کچھ کنمناہٹیں — ملتی ہیں مجھ کو پچھلے پہر تری آہٹیں

اس کائنات غم کی فسردہ فضاؤں میں — بکھرا گئے ہیں آکے وہ کچھ مسکراہٹیں[۱]

اے جسم نازنینِ نگارِ نظر نواز — صبح شبِ وصال تری ملگجاہٹیں

پڑتی ہے آسمان محبت پہ چھوٹ سی — بَل بے جبینِ ناز تری جگمگاہٹیں

چلتی ہے جب نسیم خیال خرام ناز — سنتا ہوں دامنوں کی ترے سرسراہٹیں

چشم سیہ تبسّم پنہاں لئے ہوئے — پو پھوٹنے سے قبل افق کی اداہٹیں

جنبش میں جیسے شاخ ہو گلہائے نغمہ کی — اک پیکر جمیل کی یہ لہلہاہٹیں

جھونکوں کی نذر ہے چمن انتظار دوست — یاد امید و بیم کی یہ سنسناہٹیں

ہو سامنا اگر تو خجل ہو نگاہِ برق — دیکھی ہیں عضو عضو میں وہ اچپلاہٹیں

کس دیس کو سدھار گئیں اے جمال یار — رنگیں لبوں پہ کھیلیں کے کچھ مسکراہٹیں

رُخسار تر سے تازہ ہو باغ عدن کی یاد — اور اس کی پہلی صبح کی وہ رسمساہٹیں

ساز جمال کی یہ نواہائے سرمدی — جو بن تو وہ فرشتے سنیں گنگناہٹیں

آزردگیِ حسن بھی کس درجہ شوخ ہے — اشکوں میں تیرتی ہوئی کچھ مسکراہٹیں

[۱] گورکی کا مشہور افسانہ "۲۶ آدمی اور ایک لڑکی" پڑھ کر۔

ہونے لگا ہوں خود سے قریں اے شبِ الم
میں پا رہا ہوں ہجر میں کچھ اپنی آہٹیں

میری غزل کی جان سمجھنا انھیں فراقؔ
شمعِ خیالِ یار کی یہ تھرتھراہٹیں

۱

ہے ابھی مہتاب باقی اور باقی ہے شراب
اور باقی میرے تیرے درمیاں صدہا حساب

دید اندر دید، حیرانم حجاب اندر حجاب
وائے باوصفِ ایں قدر راز و نیاز ایں اجتناب

دل میں یوں بیدار ہوتے ہیں خیالاتِ غزل
آنکھیں ملتے جس طرح اٹھے کوئی مستِ شباب

گیسوئے خمدار میں اشعارِ تر کی ٹھنڈکیں
آتشِ رخسار میں قلبِ تپاں کا التہاب

چوڑیاں بجتی ہیں دل میں مرحبا بزمِ خیال
کھلتے جاتے ہیں نگاہوں میں حسینوں کے گلاب

کاش پڑھ سکتا کسی صورت سے تو آیاتِ عشق
اہلِ دل بھی تو ہیں اے شیخ زباں اہلِ کتاب

ایک عالم پر نہیں رہتی ہیں کیفیاتِ عشق
گاہ ریگستاں بھی دریا گاہ دریا بھی سراب

کون رکھ سکتا ہے اسکو ساکن و جامد کہ زیست
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

ڈھونڈھئے کیوں استعارہ اور تشبیہ و مثال
حسن تو وہ ہے بتائیں جسکو حسن لاجواب

ہشت جنت کی بہاریں چند پنکھڑیوں میں بند — غنچہ کھلتا ہے تو فردوسوں کے کھل جاتے ہیں باب

آ رہا ہے ناز سے سمتِ چمن وہ خوش خرام — دوش پر وہ گیسوئے شبگوں کے منڈلاتے سحاب

حسن خود اپنا نقیبِ آنکھوں کو دیتا ہے پیام — آمد آمد آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

عظمتِ تقدیرِ آدم اہلِ مذہب سے نہ پوچھ — جو مشیت نے نہ دیکھے دل نے وہ دیکھے ہیں خواب

حسن وہ جو ایک کر دے معنیٔ فتح و شکست — رہ گئی سو بار جھک کر نگاہ کامیاب

غیب کی نظریں بچا کے کچھ چرا لے وقت سے — پھر نہ ہاتھ آئیگا کچھ ہر لمحہ ہے پا در رکاب

ہر نظر جلوہ ہے ہر جلوہ نظر حیران ہوں — آج کسی بیت الحرم میں ہو گیا ہوں باریاب

یارہا ہاں بارہا میں نے دمِ فکرِ سخن — چھو لیا ہے اس سکوں کو جو ہے جانِ اضطراب

سر سے پا تک حسن ہے سازِ نمو رازِ نمو — آ رہا ہے ایک کمسن پر دبے پاؤں شباب

بزم فطرت سر بسر ہوتی ہے اک بزمِ سماع — وہ سکوتِ نیم شب کا نغمۂ چنگ و رباب

اے فراق اٹھتی ہیں حیرت کی نگاہیں باادب
اپنے دل کی خلوتوں میں ہو رہا ہوں باریاب

دیدنی ہے نرگسِ خاموش کا طرزِ خطاب — گہ سوال اندر سوال و گہ جواب اندر جواب

جوہرِ شمشیرِ قاتل ہیں کہ ہیں رگہائے ناب — ساقیا تلوار کھنچتی ہے کہ کھنچتی ہے شراب

عشق کے آغوش میں بس اک دلِ خانہ خراب — حسن کے پہلو میں صدہا آفتاب و ماہتاب

سرورِ کفار ہے عشق اور امیر المومنین — کعبہ و بتخانہ اوقافِ دلِ عالی جناب

راز کے صیغے میں رکھا تھا مشیت نے جنھیں — وہ حقائق ہو گئے میری غزل میں بے نقاب

ایک گنجِ بے بہا ہے اہلِ دل کو ان کی یاد — تیرے جورِ بے نہایت تیرے جورِ بے حساب

آدمیوں سے بھری ہے یہ بھری دنیا مگر — آدمی کو آدمی ہوتا نہیں ہے دستیاب

ساتھ غصے میں نہ چھوڑا شوخیوں نے حسن کا — برہمی کی ہر ادا میں مسکراتا ہے عتاب

عشق کی سرمستیوں کا کیا ہو اندازہ کہ عشق — صد شراب اندر شراب اندر شراب اندر شراب

عشق پر اے دل کوئی کیونکر لگا سکتا ہے حکم — ہم ثواب اندر ثواب و ہم عذاب اندر عذاب

نام رہ جاتا ہے ورنہ دہر میں کس کو ثبات — آج دنیا میں کہاں ہیں رستم و افراسیاب

راس آیا دہر کو خونِ جگر سے سینچنا — چہرۂ آفاق پر کچھ اچھلی ہے آب و تاب

اسقدر رشک اے طلبگارانِ سامانِ نشاط — عشق کے پاس اک دلِ پرسوز اک چشمِ پرآب

اب اسے کچھ اور کہتے ہیں کہ حسنِ اتفاق — اک نظر اڑتی ہوئی سی کر گئی مجھ کو خراب

ایک سناٹا اٹوٹ اکثر اور اکثر اے ندیم
دل کی ہر دھڑکن میں صد زیر و بم چنگ و رباب

آرہے ہیں گلستاں میں خیر و برکت کے پیام
ہے صدا باد صبا کی یا دعائے مستجاب

مرغ ہوں اس دشت کا کوئی نہ مارے پر جہاں
ایک ہی پنجے کے ہیں اے چرخ شاہین و عقاب

ہم سمندر متھ کے لائے گوہر راز دوام
داستانیں ملتوں کی ہیں جہاں نقش بر آب

گر گئیں میری نظر سے آج اپنی سب دعائیں
دال گیا بھی میں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب

پوچھتا ہے مجھ سے تو اے شخص کیا ہوں کون ہوں
میں وہی رسوار عالم شاعروں میں انتخاب

اے فراقؔ آفاق ہے کوئی طلسم اندر طلسم
ہے ہر اک خواب حقیقت ہر حقیقت ایک خواب

رات بھی، نیند بھی، کہانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی

ایک پیغام زندگانی بھی
عاشقی مرگ ناگہانی بھی

اس ادا کا تری جواب نہیں
مہربانی بھی سرگرانی بھی

دل کو اپنے بھی غم تھے دنیا میں
کچھ بلائیں تھیں آسمانی بھی

منصب دل خوشی لٹانا ہے — غم پنہاں کی پاسبانی بھی

دل کو شعلوں سے کرتی ہے سیراب — زندگی آگ بھی ہے پانی بھی

شادکاموں کو یہ نہیں توفیق — دلِ غمگیں کی شادمانی بھی

لاکھ حسنِ یقیں سے بڑھ کر ہے — ان نگاہوں کی بدگمانی بھی

تنگنائے دل ملول میں ہے — بحر ہستی کی بے کرانی بھی

عشق ناکام کی ہے پرچھائیں — شادمانی بھی کامرانی بھی

دیکھ دل کے نگارخانے میں — زخمِ پنہاں کی ہے نشانی بھی

خلق کیا کیا مجھے نہیں کہتی — کچھ سنوں میں تری زبانی بھی

آئے تاریخ عشق میں سو بار — موت کے دورِ درمیانی بھی

اپنی معصومیوں کے پردے میں — ہوگئی وہ نظر سیانی بھی

دن کو سورج مکھی ہے وہ نوگل — رات کو ہے وہ رات رانی بھی

دلِ بدنام تیرے بارے میں — لوگ کہتے ہیں اک کہانی بھی

وضع کرتے کوئی نئی دنیا — کہ یہ دنیا ہوئی پرانی بھی

دل کو آداب بندگی بھی نہ آئے — کر گئے لوگ حکمرانی بھی

جور کم کم کا شکریہ بس ہے آپ کی اتنی مہربانی بھی

دل میں اک ہوک بھی اٹھی اے دوست یاد آئی تری جوانی بھی

سر سے پا تک سپردگی کی ادا ایک انداز ترکمانی بھی

پاس رہنا کسی کا رات کی رات میہمانی بھی میزبانی بھی

ہو نہ عکسِ جبینِ ناز کہ ہے دل میں اک نورِ کہکشانی بھی

زندگی عین دید یار فراقؔ

زندگی ہجر کی کہانی بھی

ایک شبِ غم وہ بھی تھی جس میں جی بھر آئے تو اشک بہائیں

ایک شبِ غم یہ بھی ہے جس میں اے دل رو رو کے سو جائیں

جانے والا گھر جائے گا کاش یہ پہلے سوچا ہوتا

ہم تو منتظر اس کے تھے بس کب ملنے کی گھڑیاں آئیں

الگ الگ بہتی رہتی ہے ہر انساں کی جیون دھارا

دیکھ ملیں کب آج کے بچھڑے لے لوں بڑھ کے تیز بلائیں

سنتے ہیں کچھ رو لینے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے
شاید تھوڑی دیر برس کر چھٹ جائیں کچھ غم کی گھٹائیں

اپنے دل سے غافل رہنا اہل عشق کا کام نہیں
حسن بھی ہے جس کی پرچھائیں آج وہ من کی جوت جگائیں

سب کو اپنے اپنے دکھ ہیں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے
اے دل غمگیں تیری کہانی کون سنے گا کس کو سنائیں

جسم نازنیں میں سرتاپا نرم لویں لہرائی ہوئی سی
تیرے آتے ہی بزم ناز میں جیسے کئی شمعیں جل جائیں

ہاں ہاں تجھ کو دیکھ رہا ہوں کیا جلوہ ہے کیا پردہ ہے
دل دے نظارے کی گواہی اور یہ آنکھیں قسمیں کھائیں

لفظوں میں چہرے نظر آئیں گے چشم بینا کی ہے شرط
کئی زاویوں سے خلقت کو شعر مرے آئینہ دکھائیں

مجھ کو گناہ و ثواب سے مطلب ہے لیکن عشق میں اکثر آئے
وہ لمحے خود میری ہستی جیسے مجھے دیتی ہو دعائیں

چھوڑ وفا و جفا کی بحثیں اپنے کو پہچان اے عشق

غور سے دیکھ تو سب دھوکا ہے کیسی وفائیں کیسی جفائیں

حسن اک بے بیندھا ہوا موتی یا اک بے سونگھا ہوا پھول

ہوش فرشتوں کے بھی اڑا دیں تیری یہ دوشیزہ ادائیں

باتیں اس کی یاد آتی ہیں لیکن ہم پر یہ نہیں کھلتا

کن باتوں پر اشک بہائیں کن باتوں سے جی بہلائیں

ساقی اپنا غم خانہ بھی مے خانہ بن جاتا ہے

مستِ مے غم ہو کر جب ہم آنکھوں کے ساغر چھلکائیں

اہل مسافت ایک رات کا یہ بھی ساتھ غنیمت ہے

کوچ کرو تو صدا دے دینا ہم نہ کہیں سوتے رہ جائیں

ہوش میں کیسے رہ سکتا ہوں آخر شاعرِ فطرت ہوں

صبح کے ست رنگے جھرمٹ سے جب وہ انگلیاں مجھے بلائیں

ایک غزال رم خوردہ کا منھ پھیرے ایسے میں گزرنا

جب مہکی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں دن ڈوبے آنکھیں جھپکائیں

دیں گے ثبوتِ عالی ظرفی ہم میکش سر میخانہ
ساقی چشم سیہ کی باتیں زہر بھی ہوں تو ہم پی جائیں

موزوں کرکے سستے جذبے منڈی منڈی بیچ رہے ہیں
ہم بھی خریدیں جو یہ سخنور اک دن ایسی غزل کہہ لائیں

رات چلی ہے جوگن ہوکر بال سنوارے لٹ چھٹکائے
چھپے فراق گگن پر تارے، دیپ بجھے ہم بھی سو جائیں

بندگی سے کبھی نہیں ملتی — اس طرح زندگی نہیں ملتی
لینے سے تاج و تخت ملتا ہے — مانگے سے بھیک بھی نہیں ملتی
غیب داں ہے مگر خدا کو بھی — بیت آدمی نہیں ملتی
ہے جو اک چیز دارِ فانی میں — وہ تو جنت میں بھی نہیں ملتی
ایک دنیا ہے میری نظروں میں — پر وہ دنیا ابھی نہیں ملتی
رات ملتی ہے تیری زلفوں سے — پر وہ آراستگی نہیں ملتی

یوں تو ہر اک کا حسن کافر ہے — پر تری کافری نہیں ملتی

باصفا دوستی کو کیا روئیں — باصفا دشمنی نہیں ملتی

آنکھ ہی آنکھ ہوں مگر مجھ سے — نرگسِ سامری نہیں ملتی

جب تک اونچی نہ ہو ضمیر کی لو — آنکھ کو روشنی نہیں ملتی

سوزِ غم سے نہ ہو جو مالا مال — دل کو سچی خوشی نہیں ملتی

رونے دھونے سے حال عاشق کو — زلف کی ابتری نہیں ملتی

روئے جانا کجا، کجا گلِ خلد — وہ تر و تازگی نہیں ملتی

تجھ میں کوئی کمی نہیں پاتے — تجھ میں کوئی کمی نہیں ملتی

ہیں سوا میرے اور نرم نوا — پردہ آہستگی نہیں ملتی

یوں تو پڑتی ہے ایک عالم پر — نگہ سرسری نہیں ملتی

صحنِ عالم کی سرزمینوں میں — دل کی افتادگی نہیں ملتی

آہ وہ مشک بیز زلفِ سیاہ — جس کی ہمسائیگی نہیں ملتی

عشق آزردہ بادشاہوں کو — تیری آزردگی نہیں ملتی

زہد و صوم و صلوٰۃ و تقویٰ سے — عشق کی سادگی نہیں ملتی

حسن جس کا بھی ہے نرالا ہے — پر تری طرفگی نہیں ملتی
رنگ دیوانگیٔ عالم سے — میری دیوانگی نہیں ملتی
علم ہے دستیاب با افراط — عشق کی آگہی نہیں ملتی
دل کو بے انتہائے آگاہی — عشق کی بے خودی نہیں ملتی
آج رطب اللساں ہیں حضرت دل — آپ کی بات ہی نہیں ملتی
دوستو محض طبع موزوں سے — دولتِ شاعری نہیں ملتی
ہے جو ان رسمساتے ہونٹوں میں — آنکھ کو وہ نمی نہیں ملتی
نگہ لطف سے جو ملتی ہے — ہائے وہ زندگی نہیں ملتی
یوں تو ملنے کو مل گیا ہے خدا — پر تری دوستی نہیں ملتی
میری آواز میں جو مضمر ہے — ایسی شادی غمی نہیں ملتی
وہ تو کوئی خوشی نہیں جس میں — درد کی چاشنی نہیں ملتی
میرے اشعار میں سرے سے ندیم — رجعت قہقری ہی نہیں ملتی

بس وہ بھرپور زندگی ہے فراقؔ
جس میں آسودگی نہیں ملتی

بے ٹھکانے ہے دلِ غمگیں ٹھکانے کی کہو — شام ہجراں دوستو کچھ اُسکے آنے کی کہو

ہاں نہ پوچھو اک گرفتارِ قفس کی زندگی — ہم صفیرانِ چمن کچھ آشیانے کی کہو

اُڑ گیا ہے منزلِ دشوار میں غم کا سمند — گیسوئے پرپیچ و خم کے تازیانے کی کہو

بات بنتی اور باتوں سے نظر آتی نہیں — اس نگاہِ ناز کے باتیں بنانے کی کہو

داستاں وہ تھی جسے دل بجھتے بجھتے کہہ گیا — شمع بزمِ زندگی کے جھلملانے کی کہو

کچھ دلِ مرحوم کی باتیں کرو اے اہلِ غم — جس سے ویرانے تھے آباد اس دِوانے کی کہو

داستانِ زندگی بھی کسقدر دلچسپ ہے — جو ازل سے چھڑ گیا ہے اس فسانے کی کہو

یہ فسونِ نیم شب یہ خواب ساماں خامشی — سامری فن آنکھ کے جادو جگانے کی کہو

کوئی کیا کھائے گا یوں سچی قسم جھوٹی قسم — اس نگاہِ ناز کے سوگند کھانے کی کہو

شام ہی سے گوش بر آواز ہے بزمِ سخن
کچھ فراق اپنی سناؤ کچھ زمانے کی کہو

اُجاڑ بن میں کچھ آثار سے چمن کے ملے — دلِ خراب سے وہ اپنی یاد بن کے ملے

ہر اک شام میں عالم ہے یوسفستاں کا — پرکھنے والے تو کچھ بوئے پیرہن کے ملے

تھی ایک بوئے پریشاں کبھی دل کے صحرا میں　　نشانِ پا بھی کسی آہوئے ختن کے ملے

عجیب راز ہے تنہائیٔ دل شاعر　　کہ خلوتوں میں بھی آثار انجمن کے ملے

وہ حسن و عشق جو صبح ازل کے بچھڑے تھے　　ملے ہیں وادیٔ غربت میں پھر وطن کے ملے

فقیرِ عشق کو کیا جامہ زیبیوں سے غرض　　یہی بہت ہے اگر چار گز کفن کے ملے

کچھ اہلِ بزم سخن سمجھے کچھ نہیں سمجھے　　یہ شکلِ شہرت مبہم صلے سخن کے ملے

تھا جرعہ جرعہ نئی زندگی کا اک پیغام　　جو چند جام کسی بادۂ کہن کے ملے

بزورِ طبع ہر اک تیر کو کمان کیا　　ہوئے ہیں جھک کے وہ رخصت جو مجھ سے تن کے ملے

کمندِ فکرِ رسا میں حریف مان گئے　　وہ پیچ و تاب تری زلف پر شکن کے ملے

نظر سے مطلع انوار ہو گئی ہستی　　کہ آفتاب ملا مجھ کو اس کرن کے ملے

ہر ایک نقش نگار میں ہر ایک نکہت و رنگ　　لقائے ناز میں جلوے چمن چمن کے ملے

مزاج حسن چلو اعتدال پر آیا　　جو روز روٹھ کے ملتے تھے آج من کے ملے

ارے اسی سے تو چلتے ہیں شادکام حیات　　کہ اہل دل کو خزانے غم و محن کے ملے

اسی سے عشق کی نیت بھی ہو گئی مشکوک　　گنوا دیے کئی موقعے جو حسن ظن کے ملے

ادا میں کھنچتی تھی تصویر کرشن و رادھا کی　　نگاہ میں کئی افسانے نل دمن کے ملے

حواس خمسہ پکار اُٹھے یک زباں ہو کر ۔۔۔ کئی ثبوت تری خوبیٔ بدن کے ملے
نثار کج کلہی شوخیٔ بہارِ چمن ۔۔۔ گر اِس ادا سے شگوفوں کو بانکپن کے ملے
حیات وہ نگہِ شرمگیں جسے بانٹے ۔۔۔ وہی شراب جو تیری مژہ سے چھن کے ملے

خدا گواہ کہ ہر دور زندگی میں فراق
نئے پیام گنہ مجھ کو اہرمن کے ملے

وہ آنکھ زبان ہو گئی ہے ۔۔۔ ہر بزم کی جان ہو گئی ہے
آنکھیں پڑتی ہیں میکدوں کی ۔۔۔ وہ آنکھ جوان ہو گئی ہے
آئینہ دکھا دیا یہ کس نے ۔۔۔ دنیا حیران ہو گئی ہے
اس نرگسِ ناز میں تھی جو بات ۔۔۔ شاعر کی زبان ہو گئی ہے
اب تو تری ہر نگاہ کافر ۔۔۔ ایمان کی جان ہو گئی ہے
ترغیب گناہ لحظہ لحظہ ۔۔۔ اب رات جوان ہو گئی ہے
توفیق نظر سے مشکل زیست ۔۔۔ کتنی آسان ہو گئی ہے

تصویرِ بشر ہے نقشِ آفاق　　فطرت انسان ہو گئی ہے

پہلے وہ نگاہ اک کرن تھی　　اب اک جہان ہو گئی ہے

سنتے ہیں کہ اب نوائے شاعر　　صحرا کی اذان ہو گئی ہے

اے موت بشر کی زندگی آج　　تیرا احسان ہو گئی ہے

کچھ اب تو اماں ہو کہ دنیا　　کتنی ہلکان ہو گئی ہے

یہ کس کی پڑیں غلط نگاہیں　　ہستی بہتان ہو گئی ہے

انسان کو خریدتا ہے انسان　　دنیا بھی دکان ہو گئی ہے

اکثر شبِ ہجر دوست کی یاد　　تنہائی کی جان ہو گئی ہے

شرکت تری بزمِ قصہ گو میں　　افسانے کی جان ہو گئی ہے

جو آج مری زبان تھی۔ کل　　دنیا کی زبان ہو گئی ہے

اک سانحۂ جہاں ہر وہ آنکھ　　جس دن سے جوان ہو گئی ہے

رعنائیِ قامتِ دل آرار　　میرا ارمان ہو گئی ہے

دل میں اک وارداتِ پنہاں　　بے سان گمان ہو گئی ہے

سنتا ہوں قضائے قہرماں بھی　　اب تو رحمان ہو گئی ہے

واعظ مجھے کیا خدا سے　　میرا ایمان ہو گئی ہے

میری تو یہ کائنات غم بھی　　جان و ایمان ہو گئی ہے

میری ہر بات آدمی کی　　عظمت کا نشان ہو گئی ہے

یادِ ایّام عاشقی جب　　ابدیئت اک آن ہوگئی ہے

جو شوخ نظر تھی دشمن جاں　　وہ جان کی جان ہوگئی ہے

ہر بیت فراقؔ اس غزل کی
ابرو کی کمان ہوگئی ہے

حال سنا فسانہ گو لب کی فسوں گری کے بھی
قصّے سنا اس آنکھ کے جادوِ سامری کے بھی

کعبۂ دل میں ہیں نشاں کچھ فنِ آذری کے بھی
بارگہ الٰہ میں جلوے ہیں کافری کے بھی

طرفہ طلسم رنگ و بو چہرے کی تازگی بھی ہے
کتنے عجیب راز ہیں زلفوں کی ابتری کے بھی

اہلِ نظر ہے بے پناہ شان جمال آدمی
گم ہوں حواس حور کے ہوش اڑیں پری کے بھی

دھوکے نہ بندگی کے کھا سجدۂ عشق پر نہ جا
ناصیۂ نیاز میں جلوے ہیں داوری کے بھی

حُسن رُخ نظارہ سوز دیکھ سکا نہ تو جسے
ڈھونڈھ اسی میں رنگ و نور آئینہ پروری کے بھی

تو کہ ہے منکرِ عوام ہیں جو ابھی ترے غلام
تیور اُنہی میں دیکھ آج رُعبِ سکندری کے بھی

بحرِ حیات سے نہ ڈر اس سے نہ ڈھونڈھ تو مفر
تجھ کو یہی سکھائے گا راز شناوری کے بھی

پوچھ نہ مجھ سے ہم نشیں طُرفگیِ دلِ غمیں
سازِ سکندری کے بھی سوزِ قلندری کے بھی

مثلِ فقیر بے نوا پھرتے ہیں جن کو ہم لئے
ہاں اُنہی جھولیوں میں ہیں راز تونگری کے بھی

سر بھی جھکا چکا ہے عشق حسن کے پائے ناز پر
ناز اُٹھا چکا ہے حسن عشق کی خودسری کے بھی

رات تری نگاہِ ناز کتنے فسانے کہہ گئی
غمزۂ کافری کے بھی عشوۂ دلبری کے بھی

شعلے اٹھے زمین کے دیکھ کرشمے اے نگاہ
اس کے خرام ناز کے فتنۂ سرسری کے بھی

پڑھ کبھی آیتِ شفق قلب و نظر کا واسطہ
جلوۂ رنگ رنگ میں رنگ پیمبری کے بھی

چھیڑ دیا غزل میں آج میں نے وہ نغمۂ زمیں
اُٹھ گئے گھونگھٹ اے فراقؔ زہرہ و مشتری کے بھی

زمیں بدلی فلک بدلا مذاقِ زندگی بدلا
تمدّن کے قدیم اقدار بدلے آدمی بدلا

خدا و اہرمن بدلے وہ ایمان دوئی بدلا
حدودِ خیر و شر بدلے مذاقِ کافری بدلا

نئے انسان کا جب دورِ خود ناآگہی بدلا
رموزِ بیخودی بدلے تقاضائے خودی بدلا

بدلتے جا رہے ہیں ہم بھی دنیا کو بدلنے میں
نہیں بدلی ابھی دنیا، تو دنیا کو ابھی بدلا

نئی منزل کے میرِ کارواں بھی اور ہوتے ہیں
پُرانے خضرِ رہ بدلے وہ طرزِ رہبری بدلا

کبھی سوچا بھی ہے اے نظمِ کہنہ کے خداوندو
تمھارا حشر کیا ہوگا جو یہ عالم کبھی بدلا

اِدھر پچھلے سے اہلِ مال و زر پر رات بھاری ہے
اُدھر بیداریِ جمہور کا انداز بھی بدلا

زہے سوزِ غمِ آدم خوشا سازِ دلِ آدم
اسی اک شمع کی لو نے جہانِ تیرگی بدلا

نئے منصور ہیں صدیوں پُرانے شیخ و قاضی ہیں
نہ فتوے کفر کے بدلے نہ عذرِ دار ہی بدلا

بتائے تو بتائے اسکو تیری شوخیِ پنہاں
تری چشمِ توجہ ہے کہ طرزِ بے رُخی بدلا

بہ فیضِ آدمِ خاکی زمیں سونا اُگلتی ہے
اسی ذرّے نے دورِ مہر و ماہ و مشتری بدلا

ستارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکائے سوتی ہے
دبے پاؤں کسی نے آ کے خوابِ زندگی بدلا

فراقِ ہمنوائے میر و غالب، اب نئے نغمے
وہ بزمِ زندگی بدلی وہ رنگِ شاعری بدلا

نگاہوں میں وہ حل کئی مسائل حیات کے
وہ گیسوں میں پیچ و خم کئی معاملات کے

ہماری انگلیوں میں دھڑکنیں ہیں سازِ دہر کی
ہم اہلِ راز پا رکھی ہیں نبضِ کائنات کے

ہر آب و گل میں شعلہ زن بس ایک سازِ سرمدی
حجابِ دہر پر پڑے ہیں ترنمِ حیات کے

یہ قشقۂ سُرخ سُرخ رو کش چراغِ طور ہے
جبینِ کفر سے عیاں رموزِ الٰہیات کے

اساتذہ کے بس کے جو تھے سب مجھے سکھا دیئے
سکوتِ سرمدی نے وہ نکات شعریات کے

نظر جو صاف آ رہے ہیں خانہ ہار بے خطر
وہی بساطِ گنجفہ میں ہیں مقام مات کے

ہزار ہا اشارے پائیں گے تلاش شرط ہے
قدیم فکریات میں جدید فکریات کے

نجات کیلئے نہ انتظارِ مرگ و حشر کر
کہ قید و بندِ زندگی میں راز ہیں نجات کے

یہ صف بہ صف مناظرِ زمانہ دیکھ غور سے
ہیں آئینہ در آئینہ سبق تحیرات کے

جماہیاں سی لے رہے ہیں آسمان پر نجوم
سنا رہی ہے زندگی فسانے کٹتی رات کے

کہاں سے ہاتھ لائیے انھیں اٹھانے کیلئے
حجاب در حجاب جلوے ہیں تعیُّنات کے

کتاب میں یہ درسیات ڈھونڈھنا فضول ہے
ان انکھڑیوں سے سیکھ کچھ رموز کفریات کے

انھی میں اپنے خط و خال دیکھتی ہے زندگی
یہ آب و تاب شعر ہیں کہ آئینے حیات کے

تمام عمر عشق کا جواز ڈھونڈھتے رہے
یہ اہلِ رسم ہو رہے انھی تکلّفات کے

قلم کی چند جنبشوں سے اور میں نے کیا کیا　　یہی کہ کھل گئے ہیں کچھ رموز سے حیات کے
افق سے تا افق یہ کائنات محو خواب تھی　　نہ پوچھ دے گئے ہیں کیا مجھے وہ لمحے رات کے

نماز شاعری ہے اور امامِ فن فراقؔ ہے
رکوع اور سجود زیر و بم ہیں صوتیات کے

یہ صباحت کی ضو مہ چکاں مہ چکاں　　یہ پسینے کی رو کہکشاں کہکشاں
عشق تھا ایک دن داستاں داستاں　　آج کیوں ہے وہی بے زباں بے زباں
دل کو پایا نہیں منزلوں منزلوں　　ہم پکار آئے ہیں کارواں کارواں
عشق بھی شادماں شادماں ان دنوں　　حسن بھی ان دنوں مہرباں مہرباں
ہے ترا حسن دلکش سراپا سوال　　ہے تری ہر ادا چیستاں چیستاں
دم بدم شبنم و شعلہ کی یہ لویں　　سر سے پا تک بدن گلستاں گلستاں
بیٹھنا ناز سے انجمن انجمن　　دیکھنا ناز سے داستاں داستاں
مہکی مہکی فضا خوشبوئے زلف سے　　نکھڑی ہونٹ کی گلفشاں گلفشاں

جس کے سائے میں اک زندگی کٹ گئی — عمرِ زلفِ رسا جاوداں جاوداں

لے اڑی ہے مجھے بوئے زلفِ سیہ — یہ کھلی چاندنی بوستاں بوستاں

آج سنگم سراسر جو عشق ہے — ایک دریائے غم بیکراں بیکراں

جس طرف جایئے مطلعِ نور نور — جس طرف جایئے مہوشاں مہوشاں

بو زمیں سے مجھے آرہی ہے تری — تجھ کو کیوں ڈھونڈھئے آسماں آسماں

سچ بتا مجھ کو کیا یونہی کٹ جائے گی — زندگی عشق کی رائیگاں رائیگاں

روپ کی چاندنی سوزِ دل سوزِ دل — موجِ گنگ و چمن سازِ جاں سازِ جاں

عہد و پیماں کوئی حسن بھی کیا کرے — عشق بھی تو ہے کچھ بدگماں بدگماں

جیسے کونین کے دل پہ ہو بوجھ سا — عشق سے حسن ہے سرگراں سرگراں

کیوں فضاؤں کی آنکھوں میں ننھے اشک سے — وہ سدھارے ہیں جب شادماں شادماں

لب پہ آئی نہ وہ بات ہی ہم نشیں — آئے کیا کیا سخن درمیاں درمیاں

ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ڈھونڈ لیں گے تجھے — گو نشاں ہی ترا بے نشاں بے نشاں

میرے دارالاماں اے حریمِ نگار — ہم پھریں کیا یونہی بے اماں بے اماں

یوں گھلے گا گھلے گا ترے عشق میں — رہ گیا عشق اب استخواں استخواں

ہم کو سُننا بہر حال تیری خبر ۔۔ ماجرا ماجرا داستاں داستاں

اس کے تیور پہ قربان لطف و کرم ۔۔ مہرباں مہرباں قہرماں قہرماں

جی میں آتا ہے تجھ کو پکارا کروں ۔۔ رہگزر رہگزر آستاں آستاں

یاد آنے لگیں پھر ادائیں تری ۔۔ دل نشیں دل نشیں جانستاں جانستاں

دکیوں ترے غم کی چنگاریاں ہوگئیں ۔۔ سوزِ دل سوزِ دل سوزِ جاں سوزِ جاں

ساتھ ہے رات کی رات وہ رشکِ مہ ۔۔ میزباں میزباں میہماں میہماں

عشق کی زندگی بھی غرض کٹ گئی ۔۔ غمزدہ غمزدہ شاداں شاداں

اب پڑے اب پڑے اُسکے ماتھے پہ بل ۔۔ الحذر الحذر الاماں الاماں

عشق خود اپنی تعریف یوں کر گیا ۔۔ اہرمن اہرمن ایزداں ایزداں

کیف و مستی ہیں امکاں در امکاں فراق

چاندنی ہے ابھی نوجواں نوجواں

زہے آب و گل کی یہ کیمیا ہے چمن کہ معجزۂ نمو

نہ خزاں ہے کچھ نہ بہار کچھ، وہی خار و خس وہی رنگ و بو

مری شاعری کا یہ آئینہ کرے ایسے کو ترے روبرو
جو تری ہی طرح ہو سربسر جو تجھی سے ملتا ہو مو بمو
اسی سوز و ساز کی منتظر تھی بہار گلشن آرزو
ترے رنگ رنگ نشاط سے مرے غم کی آنے لگی ہے بو
وہ چمن پرست بھی ہیں جنھیں یہ خبر ہوئی ہی نہ آج تک
کہ گلوں کی جس سے ہے پرورش رگِ خار میں ہے وہی لہو
ہوئی ختم صحبت میکشی، یہی داغ سینوں میں رہ گیا
کہ طلوع ہونے سے رہ گئے کئی آفتابِ خم و سبو
کئی لاکھ پھولوں نے پیرہن سر باغ ہنس کے اڑا دئے
زہے فصل گل وہ ہوا چلی کہ چمن کی لے اڑی آبرو
جسے اپنے آپ سے کہتے بھی مجھے آج لاکھ حجاب ہے
وہ زمانہ عشق کو یاد ہے مرا عرض غم ترے رُو برُو
تجھے پا کے میں خود کو پاؤں گا کہ تجھی میں کھویا ہوا ہوں میں
یہ تری تلاش ہے اس لئے کہ مجھے ہے اپنی ہی جستجو

ہوئی واردات سحر یہاں تو گلوں کا سینہ دھڑک گیا

یہ چلی کہ تیغ نسیم نے کئی ہاتھ اچھال دیا لہو

مرے دل میں تھا کوئی جلوہ گر وہ ہو تو کہ اور کوئی مگر

یہی خال و خط تھے بجنسہٖ، یہی روپ رنگ تھا ہو بہو

اِدھر ایک چپ تو ہزار چپ اُدھر ایک کہہ تو ہزار سُن

وہ نیاز عشق کی بے بسی وہ نگاہِ ناز کی دو بدو

وہی آنکھ جامِ مئے حیا وہی آنکھ جامِ جہاں نما

جو نگاہ اٹھتی نہیں کبھی وہ نگاہ جاتی ہے چار سو

کبھی پائے پائے ہوئے تجھے کبھی کھوئے کھوئے ہوئے تجھے

کبھی بے نیاز تلاش ہے کبھی عشق مائلِ جستجو

نہ یہ بھید حسن کا کھل سکا نہ بھرم یہ عشق کا مٹ سکا

کسی روپ میں یہ ہے تو کہ میں کسی بھیس میں یہ ہوں میں کہ تو

یہ کہاں سے بزمِ خیال میں امنڈ آئیں چہروں کی ندیاں

کوئی مہ چکاں کوئی خور فشاں کوئی زہرہ وش کوئی شعلہ رو

گہے باغ حسن عدن عدن گہے باغ حسن خُتن خُتن

تب و تاب روئے نمو نمو خم و پیچ زلفِ سیاہ مُو

وہ ادائے عذرِ ستم نہ تھی وہ نظا کوئی جادوئے سامری

مجھے آج تک نہیں بھولتی وہ نگاہِ نرگسِ حیلہ جو

مری شاعری نے کھلائے گل سرِ نوکِ خار چمن چمن

جو دیئے یہ دعوے حریف نے رگِ فکر دینے لگی لہو

تجھے اہلِ دل کی خبر نہیں کہ جہاں میں گنج لٹا گئے

یہ گداگرانِ دیارِ غم یہ قلندران تہی کدو

اب اسی کا تکیہ زمانے میں سُنا ہی مرجع خلق ہے

جو فراق تیرے لئے پھرا کبھی دربدر کبھی کو بہ کو

یہ قول ترا یاد ہے اے ساقیٔ دوراں انگور کے اک بیج میں سو میکدے پنہاں

انگڑائیاں صبحوں کی سرِ عارضِ تاباں وہ کروٹیں شاموں کی سرِ کاکلِ پیچاں

صد مہر درخشندہ چراغِ تہِ داماں | سر تا بقدم تو شفقستاں شفقستاں
پیکر یہ لہکتا ہے کہ گلزار ارم ہے | عضو چہکتا ہے کہ ہے صوت ہزاراں
زیر و بم سینہ میں وہ موسیقی بےصوت | یہ نکھڑی ہونٹوں کی ہے گلزار بداماں
یہ موجِ تبسم ہے کہ پگھلے ہوئے کوندے | شبنم زدہ غنچے لبِ لعلیں سے پشیماں
ان پتلیوں میں جیسے ہرن مائل رم ہوں | وحشت بھری آنکھیں ہیں کہ اک دشتِ غزالاں
ہر عضو بدن جام بکف ہے دمِ رفتار | اک سرو چراغاں نظر آتا ہے خراماں
اک عالم شب تاب ہے بل کھائی لٹوں پر | راتوں کا کوئی بن ہے کہ ہر کاکلِ پیچاں
تو سازِ کنہ کا ہے کوئی پردۂ رنگیں | تو سوزِ کنہ کا ہے کوئی شعلۂ رقصاں
لہرائی ہوئی زلف شکن زیرِ شکن میں | سو پہلوؤں سے عالمِ ظلمات ہیں غلطاں
اشعار مرے ترسی ہوئی آنکھوں کے کچھ خواب | ہوں صبحِ ازل سے ترے دیدار کا خواہاں
ہے دار و مدار اہلِ زمانہ کا تجھی پر | تو قطبِ جہاں قبلۂ دیں کعبۂ ایماں
ہم رند ہیں واقفِ اسرارِ زمانہ | سینے میں ہمارے بھی امینِ غمِ دوراں
آنکھوں میں نہاں خانے حقیقت کے ہیں محفوظ | دنیائے مجاز ایک توجہ کی ہے خواہاں
مستی میں بھی کس درجہ ہیں محتاط ادائیں | اک نیم نگہ روشنیِ محفلِ رنداں

پردۂ درِ اسرار نہاں نرم نگاہیں　　نباضِ غم اہرمن و مرضی یزداں

قامت ہے کہ کہسار پہ چڑھتا ہوا دن ہے　　جوبن ہے کہ ہے چشمۂ خورشید میں طوفاں

سانچے میں ڈھلے شعر ہیں یا عضوِ بدن کے　　یہ فکر نما جسم سراسر غزلستاں

ہر جنبشِ اعضا میں چھلک جاتے ہیں صد جام　　ہر گردشِ دیدہ میں کئی گردشِ دوراں

خمیازۂ پیکر میں چٹک جاتے ہیں غنچے　　رنگینیٔ قامت چمنستاں چمنستاں

ہیں جلوہ دہ بزم پسینے کے یہ قطرے　　جسمِ عرق آلود سے محفل ہے چراغاں

اب گردنِ مینا بھی ہے شائستہ زنّار　　زرکاریٔ خم دار سے ہے صاف نمایاں

اک شعلۂ بے دود ہے یا قلقلِ مینا　　یہ نغمہ ہے روشن کنِ تاریکیٔ دوراں

ساغر کی کھنک درد میں ڈوبی ہوئی آواز　　اس دورِ ترقی میں دکھی ہے بہت انساں

آتش کدۂ غیب سے لے آئے ہیں یہ لوگ　　پہلو میں ہمارے ہے دلِ شعلہ بداماں

میخانہ بھی ہے غم کدۂ زیست کی تصویر　　نم دیدہ ہیں پیمانے پیالے دلِ سوزاں

کیا ہونے کو ہے کارگہِ دہر میں ساقی　　جس سمت نظر جائے قیامت کے ہیں ساماں

کب ہوگی ہویدا افقِ خم سے نئی صبح　　شیشوں سے جھلکتا تو ہے مستقبلِ انساں

اس بادۂ سرجوش سے اٹھتی ہیں جو موجیں　　ہیں عالمِ اسرار کی وہ سلسلہ جنباں

یہ جسم ہے یا کرشن کی بنسی کی کوئی ٹیر — بل کھایا ہوا روپ ہے یا شعلۂ پیچاں

صد مہر و قمر اس میں جھلک جاتے ہیں ساقی — اک بوند مے ناب میں صد عالم امکاں

مے جوشئ صہبا میں دھڑکتا ہے دل جام — ساغر میں ہیں موجیں کہ پھڑکتی ہے رگ جاں

ساقی تری آمد کی بشارت ہے شب ماہ — نکلا وہ نصیبوں کو جگاتا مہ تاباں

جام مئے رنگیں ہیں کہ گلہائے شگفتہ — میخانے کی یہ رات ہے ہے صبح گلستاں

پوچھے نہ ہمیں تو ہی تو ہم لوگ کہاں جائیں — اے ساقئ دوراں ارے اے ساقی دوراں

ساقی یہ ترا قول ہمیں یاد رہے گا — آراستہ جس وقت ہوئی محفل رنداں

بس فرصت اک لمحہ ہے رندو کہ ہے اترا — اک لمحہ ابد کا تہہ تہہ گنبد دوراں

برحق ہے فراقؔ اہل طریقت کا یہ کہنا

یہ مے غم دنیا کو بنا دے غم جاناں

نیرنگ روزگار میں کیف دوام دیکھ — ساقی کی مست آنکھ سے گردش میں جام دیکھ

قدرت کی سیر کر ترے ہوش و جنوں کی خیر — یہ گلستان صبح یہ صحرائے شام دیکھ

بس اک نگاہ حاصلِ بزمِ نشاط ہے — روئے نگار و موجِ مئے لالہ فام دیکھ

بے جنبشِ نظر کے ہے یہ پرسشِ نہاں — یہ خاص ادائے حسن یہ اندازِ عام دیکھ

رعنائیٔ خیال کو سمجھا وصالِ دوست — یہ زعمِ عشق دیکھ یہ سودائے خام دیکھ

اٹھتی ہے چشمِ ساقیٔ میخانہ بزم پر — یہ وقت وہ نہیں کہ حلال و حرام دیکھ

ظلمت سرائے دہر میں کچھ روشنی سی ہے — اک رات کاروانِ عدم کا قیام دیکھ

یونہی نہیں ہیں نرگسِ رعنا کی گردشیں — ہر دور، ہر سکونِ نظر ہر قیام دیکھ

محرومیاں نہ دیکھ دلِ تشنہ کام کی — بزمِ نشاط، جلوۂ مئے، چھلکے جام دیکھ

ہیں موجِ نورِ گنگ و جمن، جام ساقیا — یہ رات، یہ مقام، یہ ماہِ تمام دیکھ

چشمِ سیاہ کار مٹاتی ہے مٹ بھی جا — حشرِ حیات دیکھ، لبوں کا پیام دیکھ

اُس زلف خم بہ خم میں ہی شامِ ابد کی سیر — صبحِ الست دیکھ نظر کا پیام دیکھ

کیا دیکھتا ہے غفلت و ہوش اس نگاہ کے — غافل حیاتِ غم کی فنا و دوام دیکھ

کل تک کھلا نہ تھا مرے دل کا معاملہ — آج اپنے سوز و درد کو بے ننگ و نام دیکھ

دنیا کو دیکھ لے کہ وہ دنیا نہیں رہی — برقِ نگاہ کا اثرِ ناتمام دیکھ

خوابِ گرانِ رنج و غمِ روزگار سے — جاگ اور جلوہ ہائے نشاطِ دوام دیکھ

بیکس نہیں ہے عشق بہت اے نگاہِ یار کیا تجھ کو میرے درد سے، تو اپنا کام دیکھ

ہر سانس موجِ بادۂ سرجوش ہے فراق
ہستی کو ماورائے فنا و دوام دیکھ

وعدے کی رات مرحبا آمدِ یارِ مہرباں
زلفِ سیاہ شب فشاں، عارضِ ناز مہ چکاں
برقِ جمال میں تری خفتہ سکون بے کراں
اور مرا دل تپاں آج بھی ہے تپاں تپاں
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
یاد سی آکے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں
چھیڑ کے داستان غم اہلِ وطن کے درمیاں
ہم ابھی بیچ ہی میں تھے اور بدل گئی زباں

اپنی غزل میں ہم جسے کہتے رہے ہیں بار ہا

وہ تری داستاں کہاں وہ تو ہے زیبِ داستاں

کوئی نہ کوئی بات ہے اُس کے سکوتِ یاس میں

بھول گیا ہے سب گلے آج تو عشقِ بدگماں

رات کمال کر گئیں عالمِ کرب و درد میں

دل کو مرے سلا گئیں تیری نظر کی لوریاں

سرحدِ غیب تک تجھے صاف ملیں گے نقشِ پا

پوچھ نہ یہ پھرا ہوں میں تیرے لئے کہاں کہاں

کہتے ہیں میری موت پر اس کو بھی چھین ہی لیا

عشق کو مدتوں کے بعد ایک ملا تھا ترجماں

رنگ جما کے اُٹھ گئی کتنے تمدنوں کی بزم

یاد نہیں زمین کو بھول چکا ہے آسماں

عارضیت کا سوز بھی دیکھ تو سوزِ عارضی

بنتے ہوئے جگنوں سے پوچھ کس کو ثبات ہے یہاں

کوئی نہیں جو ساتھ دے تیری حریم راز تک
بکھرے ہوئے مہ و نجوم دیتے ہیں سب ترا نشاں

جس کو بھی دیکھئے وہی بزم میں ہے غزل سرا
چھڑ گئی داستانِ دل پھر بحدیث دیگراں

بیت گئے ہیں لاکھ جُگ سوئے وطن چلے ہوئے
پہنچی ہے آدمی کی ذات، چار قدم کشاں کشاں

پاؤں سے فرقِ ناز تک برق تبسّمِ نشاط
حسنِ چمن فروش کو دیکھ جہاں سے گلستاں

دادِ سخنوری ملی اَبروِ ناز اُٹھ گئے
ہے وہی داستانِ دل حسن بھی کہہ اٹھے کہ ہاں

جیسے کھلا ہوا گلاب چاند کے پاس لہلہائے
رات وہ دستِ ناز میں جام نشاط ارغواں

راز وجود کچھ نہ پوچھ صبحِ ازل سے آج تک
کتنے یقین چل بسے کتنے گزر گئے گماں

نرگسِ ناز مرحبا زدمیں ہے جس کی کائنات
ٹپکی ہیں ناوکِ نگاہ چُٹی بھویں کماں کماں

تجھ سے یہی کہیں گی کیا گذری ہے مجھ پہ رات بھر
جو مری آستیں پہ ہیں تیرے غموں کی سرخیاں

حسنِ ازل کی جلوہ گاہ آئینۂ سکوتِ راز
دیکھ تو ہے عیاں عیاں پوچھ تو ہے نہاں نہاں

دور بہت زمیں سے پہنچی ہے اک کرن کی چوٹ
نیم تبسّمِ خفی! رہ گئیں پس کے بجلیاں

کتنے تصورات کے، کتنے ہی واردات کے
لعل و گہر لٹا گیا دل ہے کہ گنج شائیگاں

سینوں میں درد بھر دیا چھیڑ کے داستانِ حُسن
آج تو کام کر گئی عشق کی عمر رائیگاں

آہ فریب رنگ و بو اپنی شکست آپ ہے
بعد نظارۂ بہار بڑھ گئیں اور اُداسیاں

اے مری شام انتظار کون یہ آ گیا لئے

زلفوں میں ایک شب دراز آنکھوں میں کچھ کہانیاں

مجھ کو فراقؔ یاد ہے پیکرِ رنگ و بوئے دوست

پاؤں سے تا جبینِ ناز مہر فشاں و مہ چکاں

ہم نوا کوئی نہیں ہے وہ چمن مجھ کو دیا
ہم وطن بات نہ سمجھیں وہ وطن مجھکو دیا

اے جنوں آج اُن آنکھوں کی دلا کر مجھے یاد
تو نے سو خطّۂ آہوئے ختن مجھکو دیا

مژدۂ کوثر و تسنیم دیا اوروں کو
شکرِ صد شکر غمِ گنگ و جمن مجھکو دیا

ڈھک لئے تاروں بھری رات نے ہستی کے عیوب
آنسوؤں نے شبِ غربت میں کفن مجھکو دیا

پر فرشتوں کو دیئے تو نے تو کیا غم اس کا
یہی کیا کم ہے کہ انساں کا چلن مجھکو دیا

ارضِ جنت کے بھی بس میں نہیں جس کا دینا
ہند کی خاک نے وہ سوزِ کفن مجھکو دیا

وحدتِ عاشق و معشوق کی تصویر ہوں میں
نل کا ایثار تو اخلاصِ دمن مجھکو دیا

قدِ رعنا کی قسم نرمِ صباحت کی قسم
عشق نے کیا چمنِ سرو و سمن مجھکو دیا

مل گیا تجھ کو جمالِ رُخِ رنگیں کا چمن
دلِ سوزاں کا یہ تپتا ہوا بن مجھکو دیا

تیرے بطلان تھے لائے جو مجھے حق کی طرف
تو نے ایمان مرا شیخ زمن مجھکو دیا

میرے دل سے مرا ہر شعر کہ اٹھا تو نے
عشوہ زار نگہ سامری فن مجھکو دیا

نعرۂ حق نے کیا مرتبۂ عشق بلند
منصبِ جلوہ دہ دار و رسن مجھکو دیا

دستِ قدرت نے بس اک پیکرِ خاکی جس میں
سحر نو کی تھی خوابیدہ کرن مجھکو دیا

ختم ہے مجھ پہ غزل گوئی دورِ حاضر
دینے والے نے وہ اندازِ سخن مجھکو دیا

شاعرِ عصر کی تقدیر نہ کچھ پوچھ فراق
جو کہیں کا بھی نہ رکھے گا وہ فن مجھکو دیا

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

مری نظریں بھی ایسے کافروں کی جان و ایماں ہیں
نگاہیں ملتے ہی جو جان اور ایمان لیتے ہیں

جسے کہتی ہے دنیا کامیابی وائے نادانی

اسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں

نگاہِ بادہ گوں یوں تو تری باتوں کا کیا کہنا

تری ہر بات لیکن احتیاطاً چھان لیتے ہیں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں

ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا

اسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں

حیاتِ عشق کا اک اک نفس جامِ شہادت ہے

وہ جانِ ناز برداراں کوئی آسان لیتے ہیں

ہم آہنگی میں بھی اک چاشنی ہے اختلافوں کی

مری باتیں بعنوانِ دگر وہ مان لیتے ہیں

تری مقبولیت کی وجہ واحد تیری رمزیت

کہ اس کو مانتے ہی کب ہیں جس کو جان لیتے ہیں

اب اس کو کفر مانیں یا بلندئ نظر جانیں

خدائے دو جہاں کو دے کے ہم انسان لیتے ہیں

جسے صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا

عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبارِ الفت میں

ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر نقصان لیتے ہیں

ہماری ہر نظر تجھ سے نئی سوگند کھاتی ہے

تو تیری ہر نظر سے ہم نیا پیمان لیتے ہیں

رفیق زندگی تھی اب انیس وقتِ آخر ہے

ترا اے موت ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں

زمانہ وارداتِ قلب سننے کو ترستا ہے

اسی سے تو سر آنکھوں پر مرا دیوان لیتے ہیں

فراق اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر

کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

ایک ایک یادِ عمر کا حاصل کہیں جسے
وہ خلوتِ خیال کہ محفل کہیں جسے

تابندگیٔ فکر کے اس آئینہ میں دیکھ
اپنا جمال تیرا مقابل کہیں جسے

ملتی ہو تو خرید، دو عالم کو بیچ کر
وہ کائنات دردِ نہاں دل کہیں جسے

ہم بحرِ عشق تیر تو جائیں مگر نہیں
ایسا کوئی کنارہ کہ ساحل کہیں جسے

لہرا رہی ہیں گردشِ خوں میں حقیقتیں
وہ کون زندگی ہے کہ باطل کہیں جسے

آتا ہے کون جانبِ گلزارِ دوش پر
وہ زلف حلقہ حلقہ سلاسل کہیں جسے

اکثر ملا ہے مجھ کو سرِ منزلِ حیات
تیرا خیال راہ میں حائل کہیں جسے

پہنائے دو جہاں میں کہاں ہے ترے سوا
اے دل کوئی مقام کہ منزل کہیں جسے

ہیں اہلِ حسن زیبِ کمر دشنۂ دو دم
اتنا نہیں ہے کوئی کہ قاتل کہیں جسے

لطفِ بیاں سکوت میں بھی! انظر نو وہ ہے
تیری نگاہِ ناز کا قائل کہیں جسے

اے سوزِ سازِ غم وہ زرِ داغِ دل لٹائیں
ہاں اس عیارِ ناز کے قابل کہیں جسے

ہوں بے نیازِ غم مگر اس دل کو کیا کروں
سارے جہاں کے درد میں شامل کہیں جسے

واعظ نے علم کو بھی کھڑا سر کے بل کیا
ایسا پڑھا لکھا ہے کہ جاہل کہیں جسے

دہوکا نہ دے تجھے مری درماندگی کہیں
ہیں وہ شکستہ پا ہوں کہ منزل کہیں جسے

جذبِ نہاں کی رو سے تو تجہ بس وہ ہے
خالِ رُخِ صبح پہ مائل کہیں جسے

وہ اک خیال کاش کہ لفظوں میں ڈھل سکے
سنجیدگی کی فکر کا حاصل کہیں جسے

گلزار میں ہزار زباں سے ہے نغمہ زن
میرا سکوت شورِ عنادل کہیں جسے

تحسینِ اہلِ فن کیلئے کر رہا ہوں پیش
آساں حدیثِ عشق کہ مشکل کہیں جسے

دیکھیں گے اس غزل میں دھڑکتا ہوا وہ دل
رعنائی خیال کا بسمل کہیں جسے

میری نوا ہے ماتمِ یک شہرِ آرزو
یعنی فراقِ اہلِ جہاں دل کہیں جسے

بطرزِ مصحفی

بزمِ ساقی سے اٹھا ہے کوئی یوں رات رہے
پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

ڈال کر سمتِ وطن ایک اچٹتی سی نگاہ
ہم سوئے دشتِ جنوں لیکے ترا نام چلے

اکثر اس عالمِ بے نام کی یاد آتی ہے
جس سے مل جاتے ہیں دنیائے محبت کے سرے

اف حجاباتِ دو عالم کہ پہنچتے نہیں ہاتھ
پردہ چھوڑا ہی وہ اس نے کہ اٹھائے نہ اٹھے

کاروبارِ دلِ عشاق عجب دھندا ہے — جس قدر فائدہ ہوا اتنے ہی گھاٹے میں رہے

کسی گونگے کا ہی سپنا تو سبھا ہرن کی — عشق وہ قصہ جسے کون کہے کون سنے

اس شہادت گہِ ہستی میں جو ڈر ڈر کے جئیں — زندگی دور رہی موت بھی پلے نہ پڑے

اس نئے دورِ محبت کے تقاضے ہیں کچھ اور — کیوں کوئی ہوش کہ عشق میں دیوانے بنے

چشمِ حیراں نے طلسمات جہاں دیکھ لیا — آج کیا کیا تری نظروں نے دیئے ہیں دھوکے

داستانِ عشق کی دہرا گئی تاروں بھری رات — کتنی یادوں کے چراغ آج جلے اور بجھے

نہ ملی پر نہ ملی کفر کی منزل اے وائے — خود کو کرتے رہے گمراہ خدا کے بندے

یہی رندوں کی دعا ہے سرِ میخانہ ترا — ساقیا جام چلے کام چلے نام چلے

موجزن کوثر و تسنیم تری زلفوں میں — جنتیں مجھ کو ملی ہیں ترے قدموں کے تلے

دولتِ درد بڑی چیز ہے اے عشق بڑا — قرعۂ فال ترے نام خدا جس کو دے

غم تصویر بھی دیکھا ہے قدِ رعنا کو — کچھ وہ پلکوں میں نمی سرد نفس، بال کھلے

ارجن و رستم و چنگیز کی ہمت نہ پڑی — کام وہ عشق نے انجام دیئے زندہ رہے

مجھ سے بالشتئے بڑھ جائیں گے اللہ رے زعم — کس ہمالہ کو یہ سر کرنے چلے ہیں بونے

کون کہتا ہے ہر اک سے نہ ملے رات تری — نگہِ ناز مری سمت کبھی گاہے گاہے

ہم تو یہ کہتے ہیں گو روتی ہے دنیا ان کو — مر گئے جو ترے بیمار فراق اچھے رہے

عمر آوارگیٔ عشق میں جب ختم ہوئی — جا کے اس وقت کھلا ہم کہیں آئے نہ گئے

اُف وہ اک بات جسے کہہ نہ سکوں تیرے حضور — آہ وہ ایک قسم مجھ سے جو کھائے نہ بنے

دیکھنے کی ہے یہ مجبوریٔ عشقِ نادم — کس طرح اپنے پسینے میں کوئی ڈوب مرے

اس نے کی پرسشِ حالات تو منھ پھیر لیا — دلِ غمگیں کے یہ انداز خدا خیر کرے

آہ ان جلوؤں کے ہوتے ہوئے قائم ہیں حواس — ہم تری انجمنِ ناز کے قابل نہ رہے

دوست کی یاد میں رونے کے تم اوقات فراق

مجھ سے جو پوچھتے ہو — رات گئے رات رہے

تو ہے سربسر کوئی داستاں ہے عجیب عالم انجمن

یہ نگاہِ ناز زباں زباں یہ سکوتِ ناز سخن سخن

یہ شعورِ صاعقہ افگنی یہ ادائے نرگسِ پرفتن

کہ پلا پلا کے لنڈھا بھی دے یہ تری نگاہ پیالہ زن

تری قربتیں بھی ہیں دوریاں یہ کرشمۂ کششِ بدن

چہ قیامتے کہ نہ می رسی زکنار من بہ کنارِ من[1]

نہ زیادہ ظرف سے دے نہ کم کہ ہیں ہاتھ اُسکے چُچے تُلے

ہے وہی آنکھ ضامن ہوش بھی وہی آنکھ ساقیٔ انجمن

مرے سینے میں ہے وہ روشنی کہ نہ عمر جس کی تبا سکیں

یہیں جلوے دورِ جدید کے یہیں پرتوِ عہدِ کہن

وہ تمام روئے نگار ہے وہ تمام بوس و کنار ہے

وہ ہے چہرہ چہرہ جو دیکھئے وہ ہے چومئے تو دہن دہن

یہ خیالِ محفلِ دوستاں کسی اجنبی کا ہے یہ بیاں

وہ جہاں نہ سمجھیں مری زباں وہی قسمتوں سے ملا وطن

وہ نظر نظر کی فسوں گری وہ سکوت کی بھی سخنوری

تری آنکھ جادوئے سامری ترے لب فسانۂ نل دمن

---

[1] ہمہ عمر باتو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمار ما　　چہ قیامتے کہ نہ می رسی زکنار ما بہ کنار ما (بیدلؔ)

وہ گناہِ آدم اولیں کہ ہے مستیوں کا وہی امیں

ہیں بشر کے خون میں آج بھی کئی جرعہ ہائے مےِ عدن

بہ کمالِ جذبِ دلِ تپاں کبھی بدلے گردشِ آسماں

کوئی صبحِ رُوئے چمن چمن کوئی شامِ زلف شکن شکن

یہ بھی اک بہانہ تھا کھانے کا تری کج کلاہیوں کی قسم

سرِ شاخسار دکھا گئے کئی بار غنچے جو بانکپن

وہ تبسّمِ لبِ نازنیں وہ بہارِ پیکرِ دل نشیں

وہی ادھ کھلی سی کلی کلی وہی تازگیِ چمن چمن

کفِ پا سے تا سرِ نازنیں کئی آنکھیں کھلتی جھپکتی ہیں

کہ تمام مسکنِ آہواں ہے دمِ خمار ترا بدن

کبھی دادِ شوق نہ دے سکا ہے دلکو پر تو دلبری

کہ لرز گیا ہے یہ آئینہ جو لچک گئی ہے کوئی کرن

کوئی میری آنکھوں سے دیکھتا تری بزمِ ناز کی وسعتیں

وہ ہر ایک گوشہ مکاں مکاں وہ ہر ایک لمحہ زمن زمن

وہ لبوں کی لعل ضیا ضیا وہ کرن ہنسی کی ذرا ذرا

تری نیم ادا بھی ادا ادا تری اک جھلک بھی یمن یمن

کوئی چیز آڑے تو آگئی کہ بخیر ہو گیا خاتمہ

مری بیکسی نے اڑھا دیا مرے آنسوؤں کا مجھے کفن

مرے دوستوں کو معمہ ہے مری نور و نار کی زندگی

جو ادھر چراغ حرم کی لو تو ادھر بھی کفر ہے شعلہ زن

کبھی ہو سکا تو بتاؤں گا تجھے راز عالم خیر و شر

کہ میں رہ چکا ہوں شروع ہی سے کبھی ایزد و کبھی اہرمن

ارے اکھڑی اکھڑی یہ زندگی ارے کھوئی کھوئی یہ زندگی

مجھے کیا وطن میں سکون ہو کہ وطن ہی آج ہے بے وطن

جسے ڈس لیا ہے زمانے نے کوئی زندگی ہے یہ زندگی

یہ سوادِ شام اجل نما یہ ضیار صبح کفن کفن

تجھے منزلیں بھی ہیں رہگذر مجھے رہگذاریں بھی منزلیں

یہی فرق ہے مرے ہمسفر وہ ترا چلن یہ مرا چلن

مری ہر غزل کو یہ آرزو تجھے سج سجا کے نکالئے
مری فکر ہو ترا آئینہ مرے نغمے ہوں ترے پیرہن

کبھی پچھلی رات کو دیکھ لے کسی سانس لیتے چراغ کو
کہ غزل ہوئی تو رگوں میں ہے وہی خستگی سی وہی تھکن

یہ اُداس اُداس یہ بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی
مگر آج کشتِ سخنوری ہے اسی کے دم سے چمن چمن

دیتے ہیں جامِ شہادت مجھے معلوم نہ تھا — ہے یہ آئینِ محبت مجھے معلوم نہ تھا

مطلبِ چشمِ مروت مجھے معلوم نہ تھا — تجھ کو مجھ سے تھی شکایت مجھے معلوم نہ تھا

چشمِ خاموش کی بابت مجھے معلوم نہ تھا — یہ بھی ہے حرف و حکایت مجھے معلوم نہ تھا

عشق بس میں ہے مشیت کے عقیدہ تھا مرا — اس کے بس میں ہے مشیت مجھے معلوم نہ تھا

ہفت خواں جس نے کئے طے سرِ راہِ تسلیم — ٹوٹ جاتی ہے وہ ہمت مجھے معلوم نہ تھا

آج ہر قطرۂ مے بن گیا اک چنگاری — تھی یہ ساقی کی شرارت مجھے معلوم نہ تھا

نگہِ مست نے تلوار اٹھائی سرِ بزم — یوں بدل جاتی ہے نیت مجھے معلوم نہ تھا

غمِ ہستی سے جو بیزار رہا میں اک عمر — تجھ سے بھی تھی اسے نسبت مجھے معلوم نہ تھا

عشق بھی اہلِ طریقت میں ہے ایسا تھا خیال — عشق ہے پیرِ طریقت مجھے معلوم نہ تھا

پوچھ مت شرحِ کرم ہائے عزیزاں ہمدم — اُن میں اتنی تھی شرافت مجھے معلوم نہ تھا

جب سے دیکھا ہے تجھے مجھ سے ہے میری اَن بَن — حسن کا رنگِ سیاست مجھے معلوم نہ تھا

شکل انسان کی ہو چال بھی انسان کی ہو — یوں بھی آتی ہے قیامت مجھے معلوم نہ تھا

سرِ معمورۂ عالم یہ دلِ خانہ خراب — لٹ گیا تیری بدولت مجھے معلوم نہ تھا

پردۂ عرضِ وفا میں بھی رہا ہوں کرتا — تجھ سے میں اپنی ہی غیبت مجھے معلوم نہ تھا

میں سرِ عرشِ بریں ڈھونڈ رہا تھا اس کو — تیرے قدموں میں تھی جنت مجھے معلوم نہ تھا

نقدِ جاں کیا ہے؟ زمانے میں محبت ہمدم — نہیں ملتی کسی قیمت مجھے معلوم نہ تھا

ہو گیا آج رفیقوں سے گلے مل کے جدا — اپنا خود عشق صداقت مجھے معلوم نہ تھا

دردِ دل کیا ہے کھلا آج ترے لڑنے پر — تجھ سے اتنی تھی محبت مجھے معلوم نہ تھا

دم نکل جائے مگر دل نہ لگائے کوئی — عشق کی تھی یہ وصیت مجھے معلوم نہ تھا

حسن والوں کو بہت سہل سمجھ رکھا تھا　　تجھ پہ آئے گی طبیعت مجھے معلوم نہ تھا

کتنی خلاق ہے یہ نیستیٔ عشق فراق
اس سے ہستی ہے عبارت مجھے معلوم نہ تھا

بھنور میں ازل سے ہیں دل کھوئے کھوئے　　محبت اُبھارے محبت ڈبوئے
ستارے چھپے جھلملا جھلملا کے　　ترے جاگنے والے رو رو کے سوئے
طلب اس سے کر کیمیا زندگی کی　　جو درد اور راحت کو باہم سموئے
گلے کے ترے ہار بن بن کے ٹوٹے　　بہت رونے والوں نے موتی پروئے
تری بے نیازی سے کچھ ہم بھی کہتے　　مگر کون اے دوست بات اپنی کھوئے
زمین محبت کی قسمت نہ چمکی　　مری چشم تر نے ستارے بھی بوئے
ترے آہوئے ناز دشتِ چمن میں　　کہیں پائے پائے کہیں کھوئے کھوئے
رہی راز ہی واردات محبت　　ہنسے تم بھی کچھ رونے والے بھی روئے

میں کہتا تھا جگ بیتی یا آپ بیتی ‌‌‌‌‌‌‌‌ کبھی میں بھی رویا کبھی تم بھی روئے

ہوائے محبت کے جھونکے نہ پوچھو

فراق اس ہوا میں نہ جاگے نہ سوئے

خرامِ نازِ لیلیٰ گل اندام ‌‌‌‌‌ گلِ فردوس کھلتے ہیں یہ ہر گام

تری اوقات کیا اے عشقِ ناکام ‌‌‌‌‌ اک آہِ بے اثر اک دردِ بے نام

حیاتِ بے محبت سر بسر موت ‌‌‌‌‌ محبت زندگی کا دوسرا نام

ذرا اک گردشِ چشم اور ساقی ‌‌‌‌‌ بہت انگڑائی لیتے ہیں مے آشام

بدل جاتی ہے دنیا اس کو سُن کر ‌‌‌‌‌ نیا ہے لیجیے جس دم ترا نام

نہ پوچھو وصل کے اوقات کیا تھے ‌‌‌‌‌ وہ آئے گیسو کھولے ہو گئی شام

یہ باتیں تیری چھٹکی چاندنی میں ‌‌‌‌‌ چھلکتے ہیں شبِ مہتاب میں جام

کسی کی یاد میں جی بھر کے رو لیں ‌‌‌‌‌ ہمیں بھی آج اے دل کچھ نہیں کام

ہر اک سانس اس کی ہے جانِ بہاراں ‌‌‌‌‌ وہی اک گل بدن گل پوش گل فام

جسے جانِ حیا کہتی تھی دُنیا ہر اک کو کر گئی وہ آنکھ بدنام
جمالِ بے بدل سو رنگ بدلے نگاہوں کو لیں اپنے کام سے کام
خیالاتِ پریشاں — یادِ گیسو کہاں اس کارواں کو ہو گئی شام
سکوتِ ناز سمجھے تھے جسے ہم وہی اک بات آخر کر گئی کام
اک احساس کمی تھا زندگی کو اسی غم کا محبت پڑ گیا نام
گراں ہے دورِ حاضر اک جہاں پر بڑھیں اب انقلاباتِ سبک گام
تمامجرم گنہگارِ جہاں بھی جہاں اتنے وہاں اک اور الزام
ابھی تو بحث کفر و دیں ہے ساقی ابھی یہ لب کہاں شائستۂ جام
نوائے راز سے بت خانے روشن دیئے جاتے ہیں لَو لیہائے اصنام

فراقؔ احساس کی ایسی ریاضت
حقیقی شاعری بھی ہے بڑا کام

ٹالا ہے جو ہوں ہاں کر کے انھیں سمجھیں نہ یہ میں ناشکرا ہوں
اجاب کا سمجھانا برحق خود اپنے غم کو سمجھتا ہوں

جو ہنسنے کھیلنے میں کبھی مرے حسرت سے جھلک جاتی ہے ذرا
اس زنگا رنگ زندگی میں، میں کوئی کمی سی پاتا ہوں

اُفتادِ عشق کے ماروں سے اتنا بھی کہاں کرتا ہے کوئی
اس پرسشِ غم کے میں صدقے جس حال میں بھی ہوں اچھا ہوں

تاثیر سے سوزِ نہانی کے خط و خال دمکتے جاتے ہیں
یہ راز آئنے سے پنہاں ہے میں پردۂ غم میں سنورتا ہوں

رہتی دنیا کی ہر ایک جھلک کچھ مجھ سے اشارے کرتی ہے
خود مجھ پر بھی یہ نہیں کھلتا میں کن آنکھوں کا مارا ہوں

اک بار خدا بھی انھیں دیکھے تو درد سے وہ بھی چیخ اٹھے
انسان کے جو ظلم انساں پہ ہیں میں دیکھ کے چپ ہو رہتا ہوں

جو یہ تاریک شب ہستی اک لمحے کو روشن کر جائے
کہتا ہے سرشکِ غم مجھ سے میں وہ ٹوٹا ہوا تارا ہوں

اک نیم اشارہ نیم ادا میری بے خبری کی بھی طرف
اے نرگسِ رعنا کچھ تو بتا میں کس عالم میں رہتا ہوں

اے موجِ نسیم مجھی سے ہے پنکھڑیوں کی رگ رگ میں خلش
میں فصلِ بہاری کے دل میں کانٹا سا کھٹکتا رہتا ہوں

اے جانِ جہانِ ناز و نعم میں ہوں اک پیکرِ رنج و الم
اک چشمِ کرم اک پرسشِ غم، کن امیدوں سے آیا ہوں

لوگوں کی سمجھ میں آ نہ سکا کچھ تجھ کو بھی ہے تعجب سا
سُن میری اُداسی کا کارن اے ہمدم بہت اکیلا ہوں

اپنا ہو فراق کہ اوروں کا کچھ بات ہی ایسی آن پڑی
میں آج غزل کے پردے میں دکھ درد سناتے بیٹھا ہوں

دیکھ اپنی نگاہوں کو نہ کر راہ سے بے راہ
اے نرگسِ غماز ترا میں ہوں بہی خواہ

ہاں عاشقی و اہرمنی میں نہیں کچھ فرق
از صبح ازل ہم بھی تو ہیں راندۂ درگاہ

کرنا تھی بہت پہلے توجہ اِدھر اے دوست
اب تو نگۂ لطف ہے اک صدمۂ جانکاہ

بازار جہنم کا ہے گرم آپ کے دم سے
اے شیخ زماں آپ بڑی چیز ہیں واللہ

اک ذرّۂ ناچیز سے خیرہ ہیں نگاہیں
اک قطرۂ بے مایہ کی ملتی ہی نہیں تھاہ

کل مجھ سے مشیت کے رہے مشورے تا دیر
آفاق میں اور ایسے کہاں مرد خود آگاہ

ماتھے سے مرے دھوپ اُترتی تھی سہانی
میں بھی تھا کبھی تیری نگاہوں کی گزرگاہ

اشعار میں ہیں عارض و کاکل کے وہ جلوے
ہاں دیکھ کبھی تو مری غزلوں کی شبِ ماہ

فریاد و فغاں، آہ و بکا، نالہ و شیون
اے حضرت عشق آپ کے ہیں کتنے ہوا خواہ

دل کیا ہے مرا بس تری بھولی ہوئی منزل
میں کیا ہوں بس اے دوست تری چھوڑی ہوئی راہ

ہر اک نے سنی اپنی تمنا کے مطابق
ہنگامۂ عالم ہے ترے حسن کی افواہ

کچھ ایسی بھی ہیں نوکریاں دیس میں اپنے
جاگیر کی جاگیر ہے تنخواہ کی تنخواہ

ہم عشق کی وادی کے ہیں سیاح ازل سے
تنہا کبھی پھرتے ہیں کبھی موت کے ہمراہ

اللہ سے یارانہ ہے اے حضرت واعظ
اے واہ میاں واہ میاں واہ میاں واہ

میں کیا ہوں بس اک درد میں ڈوبی ہوئی آواز
ہستی کی ہے تاثیر میں ڈوبی ہوئی اک آہ

بس ایک سکوتِ ابدی عرش سے تا فرش
بس ایک پیامِ ازلی کاہ سے تا ماہ

اے اہلِ سفر بڑھتے چلو ذوقِ طلب میں
مل جائے عجب کیا کوئی کامل بھی سرِ راہ

کچھ پوچھ نہ اب اجنبیت ارض و سما کی
اے کوچۂ محبوب ترا ساتھ چھٹا، آہ

سُن لو کہ فراق آج یہاں گرم نوا ہے
اِس دَور میں اقلیمِ سخن کا وہ شہنشاہ

وہ چپ چاپ آنسو بہانے کی راتیں — وہ اک شخص کے یاد آنے کی راتیں
شبِ مہ کی وہ ٹھنڈی آنچیں وہ شبنم — ترے حسن کے رسمسانے کی راتیں
جوانی کی دوشیزگی کا تبسم — گلِ راز کے وہ کھلانے کی راتیں
پھواریں سی نغموں کی پڑتی ہوں جیسے — کچھ اس لب سے سننے سنانے کی باتیں
مجھے یاد ہے تیری ہر صبح رخصت — مجھے یاد ہیں تیرے آنے کی راتیں

پُراسرار سی میری عرضِ تمنّا — وہ کچھ زیرِ لب مسکرانے کی راتیں
سرِ شام سے رتجگے کے وہ ساماں — وہ پچھلے پہر نیند آنے کی راتیں
سرِ شام سے تا سحر قُربِ جاناں — نہ جانے وہ تھیں کس زمانے کی راتیں
سرکیدہ تشنگی کی وہ قسمیں — وہ ساقی سے باتیں بنانے کی راتیں
ہم آغوشیاں شاہدِ مہرباں کی — زمانے کے غم بھول جانے کی راتیں

فراقؔ اپنی قسمت میں شاید نہیں تھے
ٹھکانے کے دن یا ٹھکانے کی راتیں

یہ تو نہیں کہ غم نہیں — ہاں مری آنکھ نم نہیں
تم بھی تو تم نہیں ہو آج — ہم بھی تو آج ہم نہیں
نشہ سنبھالے ہے مجھے — بہکے ہوئے قدم نہیں
قادرِ دو جہاں ہے گو — عشق کے دم میں دم نہیں
موت اگرچہ موت ہے — موت سے زیست کم نہیں
کس نے کہا یہ تم سے خضر — آبِ حیات سم نہیں

کہتے ہو دہر کو بھرم — مجھ کو تو یہ بھرم نہیں
اب نہ خوشی کی ہے خوشی — غم بھی اب تو غم نہیں
میری نشست ہے زمیں — خلد نہیں اِرم نہیں
اور ہی ہے مقامِ دل — دیر نہیں حرم نہیں
قیمتِ حسنِ دو جہاں — کوئی بڑی رقم نہیں
عہدِ وفا ہے حسنِ یار — قول نہیں قسم نہیں
لیتے ہیں مول دو جہاں — دام نہیں درم نہیں
صوم و صلوٰۃ سے فراقؔ — میرے گناہ کم نہیں

لطف نہیں کرم نہیں — جور نہیں ستم نہیں
اب نہیں روئے مہ چکاں — گیسوئے خم بہ خم نہیں
بر سرِ عالمِ وجود — کون سی شے عدم نہیں
یوں ہی نکل گئی اک آہ — رنج نہیں الم نہیں
کیا مری زندگی تری — بھولی ہوئی قسم نہیں

قائل حسن دلفریب آپ نہیں کہ ہم نہیں
میں ترا موردِ عتاب اس سے بڑا کرم نہیں
عالمِ حسن محض یار عالمِ کیف و کم نہیں
جس کے لئے غزل کہوں ایسا کوئی صنم نہیں
کب سرساز کائنات عالم زیر و بم نہیں
کب کوئی آ ہوئے جمیل مائلِ عزمِ رم نہیں
مظہرِ دو جہاں ہوں میں عشق ہوں جام جم نہیں
رقص شرر سے دیرپا زندگیٔ اُمم نہیں
ہاں کوئی اور ہی قسم کھائی ہوئی قسم نہیں
آج بہت اُداس ہوں یوں کوئی خاص غم نہیں
ہائے یہ بیخودیٔ غم آئے جو وہ تو ہم نہیں
غالبؔ و میرؔ مصحفیؔ ہم بھی فراقؔ کم نہیں

زلفِ سیہ ختن ختن جلوۂ رخ چمن چمن

ہائے یہ شوخیِ سخن — بات میں بات کن میں کن
پوچھ ضمیرِ عشق سے — رازِ خدا و اہرمن
ہر شبِ غم گزر گئی — اوڑھے ستاروں کا کفن
یاد نہیں کہ کب ہوا — نشّۂ سرخوشی ہرن
خود ہی ہے داستانِ شوق — تیرا جمال بے سخن
سب ہے کرشمۂ انا — کھانہ فریب ماؤ من
جلوے نہیں یہ چہرے ہیں — تو ہے خود ایک انجمن
شعر سے بھی لطیف تر — اس کی نزاکتِ بدن
ہے شبِ میکدہ کی جان — نرگسِ صد پیالہ زن
آنکھ طلسمِ شام ہے — یا کوئی آہوئے ختن
مستیِ عشق سر بسر — نشۂ بادۂ کہن
مذہب و ملت و نظام — بدلیں گے یہ زمن زمن
عشق ہو اور بدگماں — روٹھ کے اس ادا سے من
ہے یہ خطابِ ناز یا — اڑتے ہیں برگ یاسمن

تیرے خرامِ ناز میں ٹھنڈی ہواؤں کا چلن
خوشبوئیں جیسے مسکرائیں پوچھ نہ ناز کی تن
جیسے فضا پچھاڑیں کھائے ہائے یہ بوئے پیرہن
کس کے یہ عضو عضو سے آتی ہے خوشبوئے دہن
اس کے سکوتِ ناز میں ماجرا ہائے نلدمن
کرشن کی بانسری سے دیکھ سطحِ چمن شکن شکن
میں ہوں فراقؔ خود ہی لکھ انجمنوں کی انجمن

زیر و بم سے سازِ خلقت کے جہاں بنتا گیا یہ زمیں بنتی گئی یہ آسماں بنتا گیا
داستانِ جورِ بیحد خون سے لکھتا ہی رہا قطرہ قطرہ اشکِ غم کا بیکراں بنتا گیا
عشقِ تنہا سے ہوئیں آباد کتنی منزلیں اک مسافر کارواں در کارواں بنتا گیا
میں ترے جس غم کو اپنا جانتا تھا وہ بھی تو زیبِ عنوانِ حدیثِ دیگراں بنتا گیا
بات نکلے بات سے جیسے وہ تھا تیرا بیاں نام تیرا داستاں در داستاں بنتا گیا
ہم کو ہے معلوم سب رودادِ علم و فلسفہ ہاں ہر ایمان و یقیں وہم و گماں بنتا گیا

میں کتاب دل میں اپنا حال غم لکھتا رہا
ہر ورق اک باب تاریخ جہاں بنتا گیا

بس اسی کی ترجمانی ہے مرے اشعار میں
جو سکوت راز رنگیں داستاں بنتا گیا

میں نے سونپا تھا تجھے اک کام ساری عمر میں
وہ بگڑتا ہی گیا اے دل کہاں بنتا گیا

واردات دل کو دل ہی میں جگہ دیتے رہے
ہر حساب غم حساب دوستاں بنتا گیا

میری گھٹی میں پڑی تھی ہو کے حل اردو زباں
جو بھی میں کہتا گیا حسن بیاں بنتا گیا

وقت کے ہاتھوں یہاں کیا کیا خزانے لٹ گئے
ایک تیرا غم کہ گنج شائگاں بنتا گیا

سرزمین ہند پر اقوام عالم کے فراقؔ
قافلے لیتے گئے ہندستاں بنتا گیا

ہر عقدۂ تقدیر جہاں کھول رہی ہے
ہاں دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے

انگڑائیاں لیتی ہے تمنا تری دل میں
شیشے میں پری ناز کے پر تول رہی ہے

رہ رہ کے کھنک جاتی ہے ساقی یہ شب ماہ
اک جام پلا خنکی شب بول رہی ہے

دل تنگ ہے شب کو کفن نور پنہا کے
وہ صبح جو غنچوں کی گرہ کھول رہی ہے

اک آگ لگا دیتی ہے دیوانوں کے دل میں
غنچوں کی رگوں میں جو تری ڈول رہی ہے

چھلکاتی ہے جو آنکھ نگاہوں سے گلابی
اس پردے میں وہ زہر بھی کچھ گھول رہی ہے

شبنم کی دمک ہے کہ شبِ ماہ کی دیوی
موتی سرِ گلزارِ جہاں رول رہی ہے

رکھتی ہے مشیت حدِ پروازِ جہاں بھی
انسان کی ہمت وہیں پر تول رہی ہے

پہلو میں شبِ تار کے ہے کون سی دنیا
جس کے لئے آغوشِ سحر کھول رہی ہے

ہر آن وہ رگ رگ میں چٹکتی ہوئی کلیاں
اس شوخ کی اک ایک ادا بول رہی ہے

آمادۂ عصیاں ہیں جوانانِ چمن آج
جو شاخ ہے پیمانۂ مے تول رہی ہے

خوش ہے دلِ غمگیں بھی غنیمت ہے یہ وقفہ
اس کی نگہِ ناز بھی ہنس بول رہی ہے

گو حسن کی قیمت ہے ازل ہی سے دو عالم
وہ جنسِ محبت ہی جو انمول رہی ہے

پھر از سرِ نو چونکتی جاتی ہیں نگاہیں
خاموش ہیں افلاک زمیں بول رہی ہے

اک کشفِ کرامات کا عالم ہے گلستاں
یا بادِ صبا رازِ جہاں کھول رہی ہے

چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے
آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

آتا ہے فراقؔ آج ادھر بہرِ زیارت
بت خانے کی خاموش فضا بول رہی ہے

کچھ بھی عیاں نہاں نہ تھا کوئی زماں مکاں نہ تھا
دیر تھی اک نگاہ کی پھر یہ جہاں جہاں نہ تھا

ساز وہ قطرے قطرے میں سوز وہ ذرّے ذرّے میں
یاد تری کسے نہ تھی درد ترا کہاں نہ تھا

عشق کی آزمائشیں اور فضاؤں میں ہوئیں
پاؤں تلے زمیں نہ تھی سر پہ یہ آسماں نہ تھا

سوزِ نہاں میں وہ قرار قلبِ تپاں میں وہ صفا
شعلہ تو تھا تڑپ نہ تھی آگ تو تھی دھواں نہ تھا

عشق حریم حسن میں اپنے سہارے رہ گیا
صبر کا بھی پتہ نہ تھا ہوش کا بھی نشاں نہ تھا

غفلتِ حسن جاگ اٹھی اور زبان عشق پر
آہ نہ تھی فغاں نہ تھی غم کا کوئی نشاں نہ تھا

کس کے حواس تھے بجا کون تھا اپنے ہوش میں
وقتِ بیان غم کوئی مائل داستاں نہ تھا

جلوۂ تاب آزما قائلِ عشق ہو گیا
تھی نہ صدائے الحذر نعرۂ الاماں نہ تھا

ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی
کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

دیکھ فضائے دھر کو کیفِ عدم سے بھر دیا
اے دلِ دردآشنا مرٹ کے بھی میں کہاں نہ تھا

عشق نے اپنی جان کو روگ کئی لگا لئے
ہجر و وصال اُمید و بیم کون وبالِ جاں نہ تھا

خلوتیانِ راز سے حال وصال یار پوچھ
حسن بھی بے نقاب تھا عشق بھی درمیاں نہ تھا

اب نہ وہ پرسشِ کرم اب نہ وہ چشم آشنا
شکوۂ عشق برطرف تجھ سے تو یہ گماں نہ تھا

دورِ حیات محض تھا اُس کے حریمِ راز میں
کیف و اثر کا ذکر کیا زیست کا بھی نشاں نہ تھا

شکوۂ درگذر نما کیوں ہے کہ حسن عشق سے
اتنا تو بدگماں نہ تھا اتنا تو سرگراں نہ تھا

تیری خوشی کہ یاد رکھ تیری خوشی کہ بھول جا
تجھ سے ذرا بھی بدگماں عالمِ زندگاں نہ تھا

صبر و سکوں کے راز کچھ باتوں میں کھل گئے مگر
عشق کو بھی خوشی نہ تھی حسن بھی شادماں نہ تھا
پھر بھی شکونِ عشق پر آنکھ بھر آئی بارہا
گو غمِ ہجر بھی فراق کچھ غمِ جاوداں نہ تھا

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا — وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

پھر ترا غم وہی رسوائے جہاں ہے کہ جو تھا — پھر فسانہ بحدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کے مانند اُڑی جاتی ہیں — وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا — آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا

یوں تو اس دَور میں بے کیف سی ہے بزمِ حیات — ایک ہنگامہ بسرِ رطلِ گراں ہے کہ جو تھا

لاکھ کر جور و ستم لاکھ کر احسان و کرم — تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

آج پھر عشق دو عالم سے جدا ہوتا ہے — آستینوں میں لئے کون و مکاں ہے کہ جو تھا

عشق افسردہ نہیں آج بھی افسردہ بہت — وہی کم کم اثرِ سوزِ نہاں ہے کہ جو تھا

قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن — آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

نظر آجاتے ہیں تم کو تو بہت نازک بال — دل مرا کیا وہی اے شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

جان دے بیٹھے تھے اک بار ہوس والے بھی　　پھر وہی مرحلۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا
آج بھی صید گہ عشق میں حسن سفاک　　لئے ابرو کی لچکتی سی کماں ہے کہ جو تھا
پھر تری چشم سخن سنج نے چھیڑی کوئی بات　　وہی جادو ہے وہی حسن بیاں ہے کہ جو تھا
تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراقؔ
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

راز کو راز ہی رکھا ہوتا　　کیا کہنا گر ایسا ہوتا
حسن سے کب تک پردہ کرتے　　عشق سے کب تک پردہ ہوتا
کم کم اٹھتیں تیری نگاہیں　　اکثر خون تمنا ہوتا
کٹتے کٹتے کٹتیں راتیں　　ہوتے ہوتے سویرا ہوتا
رات کی رات کبھی میرا گھر　　تیرا رین بسیرا ہوتا
عشق نے مجھ سے کمی کی ورنہ　　مجھ پر تیرا دھوکا ہوتا
دنیا دنیا، عالم عالم　　ہوتا عشق اور تنہا ہوتا
ق
دریا دریا، صحرا صحرا　　روتا خاک اڑاتا ہوتا
آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے　　آج تو کوئی آیا ہوتا

آج تو سازِ خموش ہے عالم آج تو اُس کو پکارا ہوتا
یہ نرجن بن یہ سناٹا کوئی پتّا کھڑکا ہوتا
میں ہوں دل ہے تنہائی ہے تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا
میری رگ جاں دکھ جاتی ہے بال بھی تیرا بیکا ہوتا
تو گر اپنے ہاتھ سے دیتا پیمانا پیمانا ہوتا
آنکھ اُٹھا کر جان گنوا کے حسن کا عالم دیکھا ہوتا
پردہ داریٔ غم بھی ہے شاکی تو نے حال تو پوچھا ہوتا
ہم جو تجھے کچھ بھول بھی جاتے دردِ محبّت دونا ہوتا
کچھ تو محبت کر کے دکھاتی کچھ تو زمانہ بدلا ہوتا
اس سے تو اے جاگنے والو سویا ہوتا، کھویا ہوتا
عشق تو چپ ہے سازِ محبت تیری نظر نے چھیڑا ہوتا
کوئی کبھی کچھ دل ہی دل میں شرمایا پچھتایا ہوتا
منزل منزل دل ٹھٹکے گا آج تمھیں نے روکا ہوتا

ہم بھی فراقؔ انسان تھے آخر
ترکِ محبّت سے کیا ہوتا

راز عالم سے ہے شاید کہ مرا راز جُدا | مجھ سے ملنے میں ہے اُس آنکھ کا انداز جُدا
کوئی عیسیٰ نفسوں سے بھی ہو دمساز جُدا | دل کا انداز جدا، ساز جدا، راز جُدا
بدگماں عشق کو صد وہم و یقیں کے کھٹکے | شوخیٔ چشم سخن ساز ہے غمّاز جُدا
یوں ہی کیا کم ہے تری یاد کہ دل کو چھیڑیں | زلف پُرخم، لبِ رنگیں، نگہہ ناز جُدا
عقدۂ پیچ و خم زلف کا کھلنا معلوم | راز عالم سے ہے یہ سلسلۂ راز جُدا
تنگیٔ و وسعتِ کونین میں نسبت کیسی | درِ توبہ سے درِ میکدہ ہو باز جُدا
آہ و زاری سے کبھی سازِ محبت نہ چھڑا | غم کا انداز جُدا، عشق کا انداز جُدا
حسن کی شان تلوّن اُدھر اک آفت جان | واہمے دل کے اِدھر تفرقہ پرداز جُدا
برقِ آواز جلا دے یہ نیستانِ جہاں | ساز ہستی سے ہے سازِ لبِ اعجاز جُدا
بڑھتے بھی جاتے ہیں سب اہلِ جہاں سوئے عدم | عمر رفتہ بھی دیئے جاتی ہے آواز جُدا
پے بہ پے اڑتے ہوئے ہوش کے انداز الگ | طرز برقِ نگہہ حسن جنوں ساز جُدا
نگہ ناز دیئے جاتی ہے پیغام حیات | موت سے کھیل رہے ہیں ترے جانباز جُدا

کچھ اشارے ہیں اِدھر شوخیِ پنہاں کے فراقؔ
ہے سکوتِ نگہہِ ناز سخن ساز جُدا

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات — یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

جادو سے جن کے راز بنے سامنے کی بات — اُن آنکھوں کے دلوں پہ کھلیں کیا معاملات

مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق — اب بھی کوئی نبالے تو بگڑی نہیں ہے بات

کچھ اور بھی تو ہو ان اشارات کے سوا — یہ سب تو اے نگاہ کرم بات بات بات

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں — ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

کب تک رہے گی آنکھ تری ساز بے صدا — ہاں ٹوٹ جائے اب یہ سکوت نظر تو بات

ہم اہل انتظار کے آہٹ پہ کان تھے — ٹھنڈی ہوا تھی غم تھا ترا ڈھل چلی تھی رات

یوں تو بچی بچی سی اٹھی وہ نگاہِ ناز — دنیائے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

عشاق نے سرے سے بدل دیں مشیتیں — جو ہو سکا وہ کر گئے اب اُس کے آگے بات

جن کا سُراغ پا نہ سکی غم کی روح بھی — ناداں ہوئے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات

ہر سعی و ہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے — تعمیر زندگی کے سمجھ کچھ محرکات

اس جا تری نگاہ مجھے لے گئی جہاں — لیتی ہو جیسے سانس یہ بیجان کائنات

کیا نیند آئے اس کو جسے جاگنا نہ آئے — جو دن کو دن کرے وہ کرے رات کو بھی رات

دریا کے مدوجزر بھی پانی کے کھیل ہیں — ہستی ہی کے کرشمے ہیں کیا موت کیا حیات

اہل رضا میں شان بغاوت بھی ہو ذرا — اتنی بھی زندگی نہ ہو پابند رسمیات

ہم اہل دل ہیں چشم کرم سے بھی بے نیاز — سُن اے نگاہ یار اب آ کے آ پڑی ہے بات

ہم اہلِ غم نے رنگ زمانہ بدل دیا کوشش تو کی سبھی نے مگر بن پڑے کی بات
پیدا کرے زمین نئی آسماں نیا اتنا تو لے کوئی اثر دور کائنات
اٹھ بندگی سے مالک تقدیر بن کے دیکھ کیا وسوسہ عذاب کا کیا کاوش نجات
شاعر ہوں گہری نیند میں ہیں جو حقیقتیں چونکا رہے ہیں ان کو بھی میرے توہمات

مجھ کو تو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراقؔ
دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

آج مرگ و زیست سے مایوس ہے یہ کائنات
آہ، اے جانِ ممات اور اے حیاتوں کی حیات
جلوہ گر ہوتا ہے کوئی رسمساتی ہے حیات
ٹوٹتا ہے مدتوں کے بعد خوابِ کائنات
حسن کا جادو جگائے اک زمانہ ہو گیا
اے سکوتِ شامِ غم پھر چھیڑ اُن آنکھوں کی بات
زندگی کو زندگی کرنا کوئی آساں نہ تھا
ہضم کر کے زہر کو کرنا پڑا آبِ حیات

مُلحِ کل وہ کیا ؟ سراسر جو نہ ہو شانِ جہاد
زندگی کو یوں نہ کر ناداں صرف رسمیات
پیش خیمہ دورِ نظمِ نو کا ہے یہ دورِ کشت و خوں
موت کے ہاتھوں سجائی جائے گی بزمِ حیات
جاملی ہے موت سے آج آدمی کی بے حسی
جاگ اے صبحِ قیامت اُٹھ اب اے دردِ حیات
سر اٹھا ہاں سجدۂ دیر و حرم سے سر اُٹھا
وہ جھلکتی ہے اُفق پر آستانِ کائنات
یا خدا ہو یا فرشتے یا بہائم یا بشر
بس مسلسل ٹتے ہی رہنے میں ہے رازِ ثبات
فرق کرنا نور اور ظلمت میں مشکل ہو گیا
اس غزالِ مست سے پوچھو کوئی دن ہے کہ رات
کیا ہوا کچھ بھی نہیں اور یوں تو سب کچھ ہو گیا
معنیٔ بے لفظ ہے اے دوست دل کی واردات
میری باتیں سن کے آنکھوں میں نمی سی دیکھ لے
کافر و دیندار سے سُن دہریات و دینیات

میں نے اس آواز کو پالا ہے مر مر کے فراق
آج جس کی نرم لَو ہے شمع محرابِ حیات
تیری باتیں ہیں کہ نغمے تیرے نغمے ہیں کہ سحر
زیب دیتے ہیں فراقؔ اوروں کو کب یہ کفریات

دلوں کا سوز ترے روئے بے نقاب کی آنچ
تمام گرمیٔ محفل ترے شباب کی آنچ

ثواب خلد بریں کیا عذاب دوزخ کیا
ترے خطاب کی ٹھنڈک ترے عتاب کی آنچ

حریم عشق کے پردوں سے لَو نکلتی ہے
یہ سوز و ساز ہے کس نغمۂ رباب کی آنچ

لہکتے سبزے میں ابرِ بہار کی مستی
دہکتے پھول میں چھلکی ہوئی شراب کی آنچ

یہ کیف حسن یہ برقِ نگاہ کیا کہنا
لگا دے آگ نہ اس دامن سحاب کی آنچ

چڑھا کے ساغرِ مے جگمگا اٹھے چہرے
سمٹ کے آ گئی سینوں میں آفتاب کی آنچ

پناہ مانگ رہی ہے ہری بھری دنیا
نہ پوچھ آہ دلِ خانماں خراب کی آنچ

یہ اگلے وقتوں کے ہیں خوش ہیں باغ جنّت میں
انھیں خبر ہی نہیں کیا ہے اس ثواب کی آنچ

یہ آ گیا ہے یہاں کون کافرِ معصوم
کہ ٹھنڈی پڑ گئی دوزخ کے بھی عذاب کی آنچ

جسے سمجھتے ہیں سب موجِ کوثر و تسنیم
وہ آئینہ بھی ہے تپتے ہوئے سراب کی آنچ

سحر کی تازہ دمی چڑھتی دھوپ کی گرمی — تری نگاہ کی ٹھنڈک ترے شباب کی آنچ
رُکی رُکی سی لبِ شوق پر ہے عرضِ وصال — کہ پھونک دے نہ ترے زیرِ لب جواب کی آنچ
یہی ہے گرمئ محفل یہی ہے رونقِ بزم — نگاہ ناز ترے ذوقِ انتخاب کی آنچ
یہ رات آگ لگا دے کہیں نہ دنیا میں — یہ چاندنی یہ ہوائیں یہ ماہتاب کی آنچ
شعاعیں پھوٹ کے جیسے فضا میں گم ہو جائیں — چھلکتے جام میں یہ چشمک حباب کی آنچ
سوارِ ابلقِ ایام موسمِ گل ہے — چمن کے شعلے ہیں یا حلقۂ رکاب کی آنچ
یہ مہر و ماہ بھی اُڑتے ہوئے شرارے ہیں — کہ عرش تک ہے محبت کے پیچ و تاب کی آنچ
سمیٹ رکھے ہیں روح القدس نے پر اپنے — پہنچ رہی ہے کہاں تک اس اضطراب کی آنچ

فراقؔ وقت کے رُخ سے الٹ رہی ہے نقاب
زمیں سے تا بہ فلک ہے اس انقلاب کی آنچ

لبِ جاناں ہیں پھر تبسم ریز — ہو گئی نبضِ کائنات بھی تیز
نگہِ ناز کے بھی ساز نہ چھیڑ — یہ بھی ہے اک صدائے درد آمیز
ہیں وہی پردہ دارِ صبر و سکوں — خامشی جن کی ہے قیامت خیز
کیجئے کیا جو ہو یہ صورتِ حال — عشق بے تاب حُسن کم آمیز

رخصت اے ملّتِ کہن کہ ترا ۔ ہو گیا جام زندگی لبریز
کششِ حسنِ یار عالم گیر ۔ عشق کو اپنی ذات سے بھی گریز
اُف یہ کاریاں نگاہوں کی ۔ آہ انداز گیسوئے شب ریز
دورِ انسانیت کی شان تو دیکھ ۔ گرد ہے آج سطوتِ چنگیز
لے اُڑی کائنات برقِ جمال ۔ توسنِ ناز کو نہ کر مہمیز
ہجر اک دردِ انبساط آگیں ۔ وصل بھی اک نشاطِ غم آمیز
دیکھ سینے میں پڑ نہ جائے لیکھ ۔ ہے یہ صہبائے عشق تند اور تیز

دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ
کتنی آہستہ اور کتنی تیز[1]

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ ۔ ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
دلوں کو تیرے تبسّم کی یاد یوں آئی ۔ کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ
جھلکتی ہے کھنچی شمشیر میں نئی دنیا ۔ حیات و موت کے ملتے نہیں ہیں آج دماغ

---

[1] انقلاب کی شام کو کوئی چیز انقلاب سے زیادہ غیر متوقع نہیں ہوتی۔ (اناتول فرانس)

حریف سینۂ مجروح و آتشِ غمِ عشق
نہ گل کی چاک گریبانیاں نہ لالے کے داغ

وہ جن کے حال میں لو دے اٹھے غمِ فردا
وہی ہیں انجمن زندگی کے چشم و چراغ

تمام شعلۂ گل ہے تمام موجِ بہار
کہ تا حدِ نگہِ شوق لہلہاتے ہیں باغ

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا
سنا تو ہے کہ محبت کو ان دنوں ہے فراغ

جو تہمتیں نہ اٹھیں اک جہاں سے اُنکے سمیت
گناہگار محبت نکل گئے بے داغ

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

جہانِ راز ہوئی جا رہی ہے آنکھ تری
کچھ اس طرح وہ دلوں کا لگا رہی ہے سراغ

زمانہ کود پڑا آگ میں یہی کہہ کر
کہ خون چاٹ کے ہو جائیگی یہ آگ بھی باغ

نگاہ مطلعِ نو پر ہیں ایک عالم کی
کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

فراقؔ بزم چراغاں ہے محفلِ رنداں
سجے ہیں پگھلی ہوئی آگ سے چھلکتے ایاغ

کچھ اشارے تھے جنھیں دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم
اس نگاہ آشنا کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ غیر اپنی ہی نظر میں ہو گئے
واہ ری غفلت تجھے اپنا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ہوش کی توفیق بھی کب اہل دل کو ہو سکی
عشق میں اپنے کو دیوانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

پردہ آزردگی میں تھی وہ جان التفات
جس ادا کو رنجش بیجا سمجھ بیٹھے تھے ہم

کیا کہیں الفت میں راز بے حسی کیونکر کھلا
ہر نظر کو تیری درد افزا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بے نیازی کو تری پایا سراسر سوز و درد
تجھ کو اک دنیا سے بیگانا سمجھ بیٹھے تھے ہم

انقلاب پے بہ پے ہر گردش و ہر دور میں
اس زمین و آسماں کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بھول بیٹھی وہ نگاہِ ناز عہد دوستی
اس کو بھی اپنی طبیعت کا سمجھ بیٹھے تھے ہم

صاف الگ ہم کو جنون عاشقی نے کر دیا
خود کو تیرے درد کا پردا سمجھ بیٹھے تھے ہم

کان بجتے ہیں محبت کے سکوتِ ناز کو
داستاں کا ختم ہو جانا سمجھ بیٹھے تھے ہم

باتوں باتوں میں پیام مرگ بھی آ ہی گیا
ان نگاہوں کو حیات افزا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اب نہیں تاب سپاسِ حسن اس دل کو جسے
بے قرار شکوۂ بیجا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ایک دنیا درد کی تصویر نکلی عشق کو
کوہکن اور قیس کا قصہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہوتا چلا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

صاعقہ صاعقہ حسنِ خراماں — زلزلہ ساماں فتنۂ دوراں

حسن گلستاں حیراں حیراں — غنچہ غنچہ سر بہ گریباں

ظلمتِ دوراں بزم چراغاں — بادہ پرستاں بادہ پرستاں

خانہ حجاب ناز پہ ناداں — وحشت وحشت داماں داماں

رنگ پریدہ بوئے پریشاں — دیکھا دیکھا حسن گلستاں

سب کی حالت ایک ہی ناداں — کون ہی غم گیں کون ہی شاداں

شا کیٔ جوشِ بہار گلستاں — تنگیٔ داماں وسعتِ داماں

قربِ حسن ہے وحشت ساماں — ہوش کے پر جلتے ہیں ناداں

شعلہ و شبنم حسن گلستاں — پُرنم پُرنم، سوزاں سوزاں

دل میں اُٹھا کے رکھ لے گلستاں — کر لے علاج تنگیٔ داماں

بخت سیہ گیسوئے پریشاں — یہ بھی شبستاں وہ بھی شبستاں

گیسوئے مشکیں دشت غزالاں — نرگسِ جادو ہے کہ پرستاں

بے خبری کے ہیں سب عنواں — کون ہے گریاں کون ہی خنداں

نظریے ہیں اور بھی ناداں — اس کی محبت درد نہ درماں

حسن ہوا چالاک زمانہ — عشق ہے اب تک ناداں ناداں

اس کا پانا ہے وہ کرشمہ — سوچ تو مشکل دیکھ تو آساں

بیداری ہے اپنے سہارے　　نیند کا جھونکا گردشِ دوراں
دھواں دھواں سا گنبدِ مینا　　موجِ صہبا شعلہ لرزاں
کس کے پاؤں کی چاپ ہے دُنیا　　کون ہے صبحِ ازل سے خراماں
قطرہ قطرہ ذرّہ ذرّہ　　سازِ زمانہ شہرِ خموشاں
چھوڑ خدا کی مدد کا سہارا　　اس سے سوا ہے ہمتِ مرداں
جانِ وجود و رازِ عدم ہے　　حسن نمایاں عشوہ پنہاں
بادہ کشوں کو فکر ہے جس کی　　بادہ نہ ساغر برق نہ باراں
دونوں بھری دنیا میں لیکن　　تنہا تنہا باغ و بیاباں
ٹکرائیں نہ کہیں سیّارے　　تیز بہت ہے گردشِ دوراں
بزمِ چراغاں بھی تاریکی　　تاریکی بھی بزمِ چراغاں
کم نگہی بھی صدقے ہو گی　　دیکھ تو میرا شوقِ فراواں
تھمی تھمی سی صبحِ قیامت　　رکی رکی سی گردشِ دوراں
دونوں گردِ غبارِ منزل　　صبحِ وطن یا شامِ غریباں

رہتی دُنیا گونج اٹھی ہے بول اٹھا ہے شہر خموشاں
جیسے شفق ہو شبنم آگیں اک عالم ہے حسُن پشیماں
آنچ قفس والوں تک آئی اب کے بہت ہے شورِ بہاراں
کس کا خرام پیام جنوں ہے کس کا سکوں ہے سلسلہ جُنباں
کاوشِ دوزخ و خلدِ عبث ہے پہلے آدمی ہو لے انساں
چڑھتی چلی ہے عشق کی قیمت جنسِ حسن ہے ارزاں ارزاں
عشق کی صورت یاد رہے گی کچھ نم دیدہ کچھ غم ساماں
داغِ محبّت رازِ محبّت کم کم پیدا کم کم پنہاں
تو نے کس وادی سے پکارا چونک اٹھی ہے خاکِ شہیداں
یہ بھی فسانہ وہ بھی کہانی کیا شبِ وصل اور کیا شبِ ہجراں
دُنیا کو دُنیا کرنا ہے یہ منصوبے، ساز نہ ساماں
یوں کرتے ہیں بھاگ کے پیچھا عشق کے در پے حسن گریزاں
بات اس شوخ سے بن جانے کی کوئی نہ صورت کوئی نہ عنواں
پتّی پتّی، بوٹا بوٹا آئینہ ساماں آئینہ ساماں

دل کی کھٹک ہے دل کی خلش ہے ناوک ناوک پیکاں پیکاں

وحشت کی پرچھائیں دونوں شام بیاباں صبح گلستاں

ذرہ ذرہ ، تارا تارا ششدر ششدر حیراں حیراں

جز دل بے حس ہے اب تو حسرت حسرت ارماں ارماں

دھندلا دھندلا روشن روشن عالم عالم عالم امکاں

تجھ سے ملتی تھی کوئی صورت پیدا پیدا پنہاں پنہاں

آئے گنہگارانِ محبت نادم نادم نازاں نازاں

ڈھونڈھ لے مجھ کو دنیا دنیا صحرا صحرا زنداں زنداں

بادل بادل بجلی بجلی بادہ گساراں بادہ گساراں

آگ لگا دے حشر اٹھا دے نعرہ مستاں نعرہ مستاں

عشق کو دیکھا عشق کو پایا غم گیں غم گیں شاداں شاداں

تو نے بھرم غم عشق کے کھولے اے غم دوراں اے غم دوراں

حسن و عشق سے یکساں وحشت یہ بھی گریباں یہ بھی گریباں

ظلمت و نور ہے عشق کی ہستی تیرہ تیرہ ۔ تاباں تاباں
دوزخ کے پگھلے ہوئے شعلے چشمۂ حیواں چشمۂ حیواں
عمر فراق نے یونہی بسر کی
کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں

نرم فضا کی کروٹیں دل کو دکھا کے رہ گئیں
ٹھنڈی ہوائیں بھی تری یاد دلا کے رہ گئیں
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں
مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاہیاں تری
مجھ سے حیات و موت بھی آنکھیں چرا کے رہ گئیں
حسن نظر فریب میں کس کو کلام تھا مگر
تیری ادائیں آج تو دل میں سما کے رہ گئیں

تب کہیں کچھ پتہ چلا صدق و خلوص حسن کا
جب وہ نگاہیں عشق سے باتیں بنا کے رہ گئیں

تیرے خرام ناز سے آج وہاں چمن کھلے
فصلِ بہار کی جہاں خاک اُڑا کے رہ گئیں

پوچھ نہ اُن نگاہوں کی طرفہ کرشمہ سازیاں
فتنے سلا کے رہ گئیں فتنے جگا کے رہ گئیں

تاروں کی آنکھ بھی بھر آئی میری صدائے درد پر
اُن کی نگاہیں بھی ترا نام بتا کے رہ گئیں

اُف یہ زمیں کی گردشیں، آہ یہ غم کی ٹھوکریں
یہ بھی تو بختِ خفتہ کے شانے ہلا کے رہ گئیں

اور تو اہلِ درد کو کون سنبھالتا بھلا
ہاں تیری شادمانیاں اُن کو رُلا کے رہ گئیں

یاد کچھ آئیں اس طرح بھولی ہوئی کہانیاں
کھوئے ہوئے دلوں میں آج درد اُٹھا کے رہ گئیں

سازِ نشاطِ زندگی آج لرز لرز اُٹھا !!
کس کی نگاہِ عشق کا درد سُنا کے رہ گئیں

تم نہیں آئے اور رات رہ گئی راہ دیکھتی
تاروں کی محفلیں بھی آج آنکھیں بچھا کے رہ گئیں

جھوم کے پھر چلیں ہوائیں وجد میں آئیں پھر فضائیں
پھر تری یاد کی گھٹائیں سینوں پہ چھا کے رہ گئیں

قلب و نگاہ کی یہ عید، اُف یہ مآلِ قرب و دید
چرخ کی گردشیں تجھے مجھ سے چھپا کے رہ گئیں

پھر ہیں وہی اُداسیاں پھر وہی سونی کائنات
اہلِ طرب کی محفلیں رنگ جما کے رہ گئیں

کون سکون دے سکا غم زدگانِ عشق کو
بھیگتی راتیں بھی فراقؔ آگ لگا کے رہ گئیں

جولانگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں   منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

مانا کہ تیرے لطف و کرم میں کمی نہیں   آسان اس قدر تو تری دوستی نہیں

جس پیکرِ نشاط کی رگ رگ دکھی نہیں   اس کی خوشی کو غور سے دیکھو خوشی نہیں

کچھ ٹھوکریں تو کھا چمک اٹھیں گی منزلیں   پائے طلب کو فکرِ سلامت روی نہیں

کل تجھ سے چھوٹنے کی خبر ہو رہے گی راز   لیکن یہ بات آج کسی سے چھپی نہیں

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حسنِ یار کو   اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں

کب دیکھیے دلوں کو ملے اذنِ یاس بھی   بیگانہ وار کہتی ہے وہ آنکھ ابھی نہیں

تیرے کرم سے بھی نہ ہوئی کم فسردگی   شاید تری خوشی بھی ہماری خوشی نہیں

تاریخِ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات   مجبور اتنی عشق کی بے چارگی نہیں

کس نے حقیقتوں کے خزانے لٹا دیئے   بے مایہ اس قدر مری بے مائگی نہیں

کچھ آج بھی ہے گرم و منور فضائے دہر   افسردہ اتنی عشق کی افسردگی نہیں

ہاں اے نگاہِ یار نہ بدظن ہو عشق سے　　یہ بے حسی تو مانعِ رنج و خوشی نہیں

حساس کم نہیں ہے محبت بھی اور یوں　　اس کو غم و نشاط سے دلبستگی نہیں

بیخود سے تھے تو وقت کا یہ بھی فریب تھا　　ہم اور تجھ کو دل سے بھلا دیں کبھی نہیں

ہم غمزدوں کی گفتگوئے تلخ پر نہ جا　　قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں

تکلیفِ ہجر کو نہ بنا عیشِ جاوداں　　غم کی شبِ دراز بھی اتنی بڑی نہیں

محشر کا ازدہام نظر کا فریب تھا　　اپنے سوا وہاں بھی جو دیکھا کوئی نہیں

نیند آچلی ہے انجمِ شامِ ابد کو بھی　　آنکھ اہلِ انتظار کی اب تک لگی نہیں

کچھ جھلملاہٹیں ہیں شبستانِ دہر میں　　شمعِ حیات صرصرِ غم سے بجھی نہیں

وہ عشق ہے جو مرکزِ ہر انقلاب ہے　　نیت نگاہِ یار کی بدلی ہوئی نہیں

کب سرخوشی بھی وجہِ سکوں بن سکی مگر　　اچھا کچھ اس قدر غم آسودگی نہیں

بادِ بہار دیکھ کے کس طرح یہ کہیں　　رنگینیوں کی جان تری سادگی نہیں

اے دوست یوں تو ہم تری حسرت کو کیا کہیں　　لیکن یہ زندگی تو کوئی زندگی نہیں

محفوظ تھی جو چشمِ زمان و مکاں سے بھی　　وہ زندگی بھی تیری نظر سے بچی نہیں

غفلت حیات عشق کی چونکی ہوئی سی ہے   اب پاسبان عمر رواں موت بھی نہیں
اے عشق کاروان دو عالم بچھڑ گئے   اے خضر راہ یہ تو کوئی رہبری نہیں
یہ کیفیت سکونِ سحر میں کہاں کی ہے   وہ شام ہے جو صبح بھی ہو کر کٹی نہیں
شاید کسی کو مانگتی ہیں آج بھی فراق   گو زندگی میں یوں مجھے کوئی کمی نہیں

زہرابۂ فنا جسے نشو و نما نہ دے
وہ زندگی فراق کوئی زندگی نہیں

ستاروں سے اُلجھتا جا رہا ہوں   شبِ فرقت بہت گھبرا رہا ہوں
ترے غم کو بھی کچھ بہلا رہا ہوں   جہاں کو بھی سمجھتا جا رہا ہوں
یقیں یہ ہے حقیقت کھل رہی ہے   گماں یہ ہے کہ دھوکے کھا رہا ہوں
اگر ممکن ہو لے لے اپنی آہٹ   خبر دو حسن کو میں آ رہا ہوں
حدیں حسن و محبت کی ملا کر   قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہوں

خبر ہے تجھ کو اے ضبط محبت — ترے ہاتھوں میں لٹتا جا رہا ہوں

اثر بھی لے رہا ہوں تیری چپ کا — تجھے قائل بھی کرتا جا رہا ہوں

بھرم تیرے ستم کا کھل چکا ہے — میں تجھ سے آج کیوں شرما رہا ہوں

انھیں میں راز ہیں گلباریوں کے — میں جو چنگاریاں برسا رہا ہوں

جو ان معصوم آنکھوں نے دیئے تھے — وہ دھوکے آج تک میں کھا رہا ہوں

ترے پہلو میں کیوں ہوتا ہے محسوس — کہ تجھ سے دور ہوتا جا رہا ہوں

حدِ جور و کرم سے بڑھ چلا حُسن — نگاہِ یار کو یاد آ رہا ہوں

جو اُلجھی تھی کبھی آدم کے ہاتھوں — وہ گتھی آج تک سلجھا رہا ہوں

محبت اب محبت ہو چلی ہے — تجھے کچھ بھولتا سا جا رہا ہوں

اجل بھی جن کو سن کر جھومتی ہے — وہ نغمے زندگی کے گا رہا ہوں

یہ سناٹا ہے میرے پاؤں کی چھاپ
فراقؔ اپنی کچھ آہٹ پا رہا ہوں

اب تو ہم ہیں اور بھری دنیا کی ہیں تنہائیاں ــــ یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

جلوۂ لیلیٰ ہو اے دل یا جنونِ قیس ہو ــــ حسن بھی پرچھائیاں ہے عشق بھی پرچھائیاں

تو نے سمجھا ہی نہیں ہے حسن کا رازِ نشاط ــــ تو نے دیکھی ہی نہیں ہیں عشق کی رعنائیاں

سانس کو تازہ دل و جاں کو معطر کر گئیں ــــ اُس نظر کی ٹھنڈی اور مہکی ہوئی پرچھائیاں

عشق کو سمجھا کوئی تو بس نگاہِ یار نے ــــ شہرتیں گو کم نہ تھی گو کم نہ تھیں رسوائیاں

اے ترے غم کے میں صدقے ڈوبتے جاتے ہیں دل ــــ بڑھتی جاتی ہیں حیاتِ عشق کی گہرائیاں

حسن کی کوئی جھلک رکھتی نہیں اپنا جواب ــــ کوئی دیکھے عالمِ ایجاد کی یکتائیاں

پے بہ پے کس عالمِ حیرت کی دیتی ہیں خبر ــــ گہری گہری نرگسِ رعنا کی یہ پرچھائیاں

اس پیامِ راز کو کیا حاجتِ لفظ و بیاں ــــ تو نے دیکھی بھی سکوتِ ناز کی گویائیاں

سر بسر شورِ بہاراں خوفِ دامِ رنگ و بو ــــ حسن کی پیدائیاں، رسوائیاں، گیرائیاں

بے نیازِ قرب و دوری، بے قرارِ جستجو ــــ یہ سکونِ عشق اور یہ بادیہ پیمائیاں

چپکے چپکے اُٹھ رہا ہے مدھ بھرے سینوں میں درد ــــ دھیمے دھیمے چل رہی ہیں عشق کی پروائیاں

آہ ذرّے ذرّے میں یہ جوشِ پیہم یہ اُبھار ــــ دیدنی ہیں شاہدِ دنیا کی یہ برنائیاں

اب تو غم سے غم خوشی سی کبھی خوشی ہوتی نہیں | کیا ہوئیں اے عشق وہ تیری نشاط آرائیاں [لہ]

ایک مدت سے نشاطِ حسن بھی ہے منتظر | کوئی حد رکھتی ہیں تیرے غم کی بے پروائیاں

پوچھ مت کیفیتیں ان کی نہ پوچھ انکا شمار | چلتی پھرتی ہیں مرے سینے میں جو پرچھائیاں

دیکھ جب عالم یہ ہے حسن خمار آلود پر | پچھلے کو لیتی ہو جیسے کائنات انگڑائیاں

شوخیاں یہ کب حجاب رنگ و بو میں تھیں فراقؔ
رفتہ رفتہ رنگ لائیں حسن کی رسوائیاں

چھلک کے کم نہ ہو ایسی کوئی شراب نہیں | نگاہِ نرگسِ رعنا ترا جواب نہیں

خراب حال بھی اچھی طرح خراب نہیں | یہ ہے عذاب جہنم کہ وہ عذاب نہیں

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل | وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں

حیات درد ہوئی جا رہی ہے کیا ہوگا؟ | اب اس نظر کی دعائیں بھی مستجاب نہیں

یہ سیل و برق کے تیور ہیں کاروانوں میں | کہ روک تھام اجل کی بھی سدّباب نہیں

لہ غم اور خوشی دونوں نشاط حیات کی کیفیتیں ہیں۔ (فراقؔ)

نہ ہو جو میکدہ بردوش کیا وہ مستی و کیف — جو اک جہاں پہ نہ چھا جائے وہ سحاب نہیں

زمین اس کی فلک اس کا کائنات اسکی — کچھ ایسا عشق ترا خانماں خراب نہیں

مرا عقیدہ ہے "دنیا بنام خلد بریں" — ہزار شکر مجھے کاوش ثواب نہیں

رکا ہے قافلۂ غم کب ایک منزل پر — کب انقلاب زمانے کا ہمرکاب نہیں

کچل کے سر نہ اٹھائیں حریف فکر نہ کر — کب اڑتی خاک سواروں کی ہمرکاب نہیں

جو تیرے درد سے محروم ہیں یہاں ان کو — غم جہاں بھی سنا ہے کہ دستیاب نہیں

ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی — ابھی حیات کے چہرے پر آب و تاب نہیں

جہاں کے باب میں تردامنوں کا قول یہ ہے — یہ موج مارتا دریا کوئی سراب نہیں

ٹھہر ٹھہر کے ترا دیکھنا نئی دنیا — لئے وہ کون نظر ہے جو انتخاب نہیں

نصیب ہے ہی شبستانِ غم کا چشم و چراغ — وہ روئے دوست جسے دیکھنے کی تاب نہیں

دل خراب کی بے تابیوں کا کیا ہے علاج — میں جانتا ہوں ترا جور بے حساب نہیں

جگر کو توڑ گیا ہے کڑی کماں کا تیر — وہ چوٹ کیا کرے بھرپور جو شباب نہیں

غم و نشاط ترے کس طرح کوئی جانے — ہنسی لبوں پہ نہیں آنکھ بھی پُر آب نہیں

دکھا تو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے　　خراب ہو کے کبھی یہ زندگی خراب نہیں

کہیں وہی تو گریباں نہیں ہو آج اپنا　　تر او ہ گوشۂ دامن جو دستیاب نہیں

شکستِ رنگ رخِ روزگار دیکھ فراقؔ

وہ مہر و ماہ کے چہرے پہ آب و تاب نہیں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں　　لیکن اِس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں　　لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

شکوۂ جور کرے کیا کوئی اُس شوخ سے جو　　صاف قائل بھی نہیں صاف مکرتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست　　آہ اب مجھ سے تری رنجش بیجا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں　　اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

آج غفلت بھی اُن آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا　　آج ہی خاطرِ بیمار شکیبا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام　　کنجِ زنداں بھی نہیں وسعتِ صحرا بھی نہیں

"ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں" تو نے کچھ آہ سنا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں

آہ یہ مجمع احباب یہ بزم خاموش
آج محفل میں فراقؔ سخن آرا بھی نہیں

جو یوں خراب پھرے عشق کی وہ ذات نہیں غم حیات نہیں کاوشِ مماتؔ نہیں
حیاتِ عشق کے ہاتھوں ابھی جیتا نہیں غم و خوشی کے لئے آدمی کی ذات نہیں
خطا کے بعد ندامت بھی عشق کو نہ ملی نگاہِ ناز یہ کہتی ہو کوئی بات نہیں
بلائے قربتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلےٰ جو اپنی ضد نہ ہو وہ نظم کائنات نہیں
کسی کی شوخیٔ پنہاں ہے کارگر نادان مٹانے والے دلوں کے مقدرات نہیں
پیام عشق ہے اس زلف خم بہ خم سے یہی ترے اسیر نہ کاٹیں جسے وہ رات نہیں
بچا بچا کے ہوئی کاوشِ نگہ اُس کی مٹائے مٹنے کے اے دل یہ سانحات نہیں
ملے جلے ہیں عذاب و ثواب کے مفہوم رموز عشق ہیں اے شیخ دینیات نہیں

بہت بڑھا کے نہ کر شکوۂ تلوّنِ حُسن — ارے مزاج محبت کو کبھی ثبات نہیں

نہ پوچھ، سوچ کے میں کیا اداس رہتا ہوں — جو غم نصیب محبت تجھے اُنکی بات نہیں

ہماری بُت شکنی کے جدا فسانے ہیں — حدیثِ غزنوی و ذکر سومنات نہیں

ہو آسماں کہ زمیں دوست ہو کہ دشمن ہو — ہر اک ہے عشق کے درپئے تری ہی ذات نہیں

ترے دیار سے ملتا ہوا ہی ایک دیار — یہ صبح و شام نہیں واں یہ دن یہ رات نہیں

یہ کائنات نہیں کچھ ترے سوا لیکن — یہ تیری ذات نہیں یہ ترے صفات نہیں

ہزار رُخ سے ملی ہے کسی کے حُسن کو شہ — کہ مات گنجفۂ عاشقی میں مات نہیں

ہر ایک گردش جام و سبو میں کیف دوام — رہینِ دورِ فلک میکدے کی رات نہیں

یہی ہوا کہ ترے بیکسوں پہ کچھ نہ ہوا — جو آئے لفظ و بیاں میں وہ واردات نہیں

میں یہ بھی کہہ نہیں سکتا بدل گئی وہ نگاہ — وہی ہیں لطف و کرم اب مگر وہ بات نہیں

یہ سب مجاز و حقیقت کی بحث دُور از کار — صفات کون ہیں اُسکے جو عین ذات نہیں

وہ کوہکن ہو کہ مجنوں، رئیس یا مزدور — تجھے خبر ہے محبت کسی کی ذات نہیں

رموز غدر ستم تک خیال جا نہ سکا — میں چپ رہا تو بُرا ماننے کی بات نہیں

نشاطِ حسن ازل کو بھی وجد آجاتا دکھی ہوئی مگر اتنی رگِ حیات نہیں
یہ تجھ سے چھٹتے ہی کیا ہو گیا محبت کو وہی وجود و عدم ہیں مگر وہ بات نہیں
فراق عہد وفا برطرف، یہ کیا کم ہے
کہ وہ نظر وہ عنایت وہ التفات نہیں

نہیں ہیں پھول تو خاروں کو چھیڑ سکتا ہوں خزاں میں رفتہ بہاروں کو چھیڑ سکتا ہوں
ہزاروں شمس و قمر پہلوؤں میں ہیں جن کے ان اہلِ دل کے غباروں کو چھیڑ سکتا ہوں
زماں مکاں ہیں شگفتہ نگاہ شاعر سے تمام اداس نظاروں کو چھیڑ سکتا ہوں
کچھ اور رو کے ہوئے خندہ ہائے زیرِ لبی دبے دبے سے شراروں کو چھیڑ سکتا ہوں
نگاہ شوق سے سازِ جمال بول اٹھے میں اس رباب کے تاروں کو چھیڑ سکتا ہوں
اگر عنایتِ خوباں ہے زندگی کا مدار تو زندگی کے سہاروں کو چھیڑ سکتا ہوں
تمام رمز بنا دوں یہ سادگیٔ نگاہ تری نظر کے اشاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

اشارہ ہے یہ ترے زیر لب تبسّم کا — نگاہِ ناز کے ماروں کو چھیڑ سکتا ہوں

نئے سرے سے پڑے جان جتنے مردوں میں — میں چلتے پھرتے مزاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

جو تیرے گیسوئے پُرخم سے کھیل بھی نہ سکیں — ان انگلیوں سے ستاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

فراقؔ غم بھی مرا ہے حریف زندہ دلی
فسردگی میں بھی یاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

ہری بھری بھی ہو سکی دلوں کی سرزمیں کہیں — پڑی تری نگاہ بھی کبھی کبھی کہیں کہیں

اشارے کھل کے کر سکی نگاہِ شرمگیں کہیں — یہ سب سہی یہ ہو نہ ہو یہ بجلیاں گریں کہیں

یہ تیرگی یہ ابتری، یہ نکہتیں یہ مستیاں — کہ کھل پڑی ہو جس طرح وہ زلف عنبریں کہیں

نگاہ ناز پردے پردے میں تھی مائل کرم — وہ رسم دلبری نہیں اب اے دل حزیں کہیں

تمام انقلاب ہر مجال کیا ٹھہر سکے — یہ دور آسماں کہیں یہ گردش زمیں کہیں

مجھے نبا رہے ہیں بے نیاز شوق آگہی — تری نگاہ نے بھی یہ کہانیاں سنیں کہیں

بس ابتدا ہی ابتدا ہے زندگیٔ عشق میں — کہ بھول بھی سکی تری نگاہ اولیں کہیں

پڑی نگاہ دل پر اور بنائے دہر ہل گئی — کہیں تھی اور پہنچ گئی یہ موج تہ نشیں کہیں

کہاں یہ دور آسماں کہاں یہ نظم زندگی — ہزاروں ایسی محفلیں وہ انکھیں لے اڑیں کہیں

غم نہاں کے عکس ہیں جراحتوں کے نقش ہیں — چمن چمن جہانِ رنگ و بو نہ ہوں یہیں کہیں

کہیں تو داغ سوز عشق روشن اور کہیں بجھے — دھواں دھواں اُداس اداس وہ رخ حسیں کہیں

چمن کی رازداریوں کا اے صبا خیال کر — ارے لہو نہ دے اٹھے گلوں کی آستیں کہیں

ہم اہل درد کو کچھ ایسی وحشتیں نہیں مگر — کوئی دیار عافیت بتا نہ دو تمہیں کہیں

دل و جگر بچا کے تو نے جو دیئے تھے عشق کو — وہ زخم ابھر چلے کہیں وہ چوٹیں رہ گئیں کہیں

معاملے نہ کھل سکے نگاہ رنگ رنگ کے — ہے جلوت آفریں کہیں ہے خلوت آفریں کہیں

اسے گزرتے دیکھ کر جھپک کے آنکھ رہ گئی — شرارے اڑ گئے تھے کچھ ابھی ابھی یہیں کہیں

فراقؔ زیر آسماں چمک بھی ہے دھواں بھی ہے
کہ جیسے اٹھ رہی ہو وہ نگاہ شرمگیں کہیں

"یاد نہ کر دلِ حزیں بھولی ہوئی کہانیاں" — اُٹھتی ہوئی جوانیاں حسن کی شادمانیاں

اُف تری پرسشِ کرم اُف تری مہربانیاں — بڑھتی ہی جا رہی ہیں دیکھ عشق کی بدگمانیاں

موج ٹھہر سکی کہیں سطح پہ ہو کہ تہ نشیں — عشق میں بے سکوں یونہی کٹتی ہیں زندگانیاں

رنگِ بہارِ زندگی خون کے آنسوؤں سے ہے — عشق کی گلفشانیاں عشق کی شادمانیاں

یہ بھی کوئی جہان ہے یہ بھی کوئی نظام ہے — آہ وہ دل جہاں نہیں عشق کی حکمرانیاں

آج فضا کی خامشی کچھ اسے پھر سنا گئی — بھولی ہوئی تھیں عشق کو حسن کی خوش بیانیاں

اُف یہ فضا اداس اداس آہ یہ موجِ دودِ شام — یاد سی آ کے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں

عشق کے ہر نشاط میں رنگِ جراحتیں نہاں — نشترِ نازِ حسن کی مٹ نہ سکیں نشانیاں

پوچھ نہ کس طرح اڑا رنگ سکوتِ سرمدی — عشق کی بازپرس پر حسن کی بے زبانیاں

اس سے زیادہ اور کیا اب کوئی نامراد ہو — آج نظر سے گر چلیں عشق کی کامرانیاں

رازِ حیات کہہ گئے عشق کے کشتگانِ غم — درسِ حیات دے گئیں حسن کی شادمانیاں

میرے سکوتِ یاس نے رنگِ جہاں بدل دیا — آہ و فغاں سے کب ہوئیں عشق کی ترجمانیاں

دیکھ یہ رنگِ حسن و عشق بہر کو رنگ لائے گیا — کچھ تجھے بدگمانیاں کچھ مجھے بدگمانیاں

عشق کے اعتدال سے ملتی ہیں سب کی سرحدیں — اپنے حدود ہی میں ہیں بحر کی بیکرانیاں

اُمڈی گھٹا میں بجلیاں جیسے چمک کے رہ گئیں — آج تو یاد آ گئیں حسن کی مہربانیاں

عکس سا پڑ کے رہ گیا جیسے تری نگاہ کا — یاد سی آ کے رہ گئیں بھولی ہوئی کہانیاں

اور ہی رنگ ہے فراقؔ اب تو شعورِ عشق کا

اب نہ وہ خوش گمانیاں اب نہ وہ بدگمانیاں

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو — بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوتِ ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا — خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم — صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہر رگِ دل وجد میں آتی رہے دکھتی رہے — یونہی اس کے جا و بیجا ناز کی باتیں کرو

جو عدم کی جان ہے جو ہے پیامِ زندگی — اُس سکوتِ راز اس آواز کی باتیں کرو

عشق رسوا ہو چلا بے کیف سا بیزار سا — آج اس کی نرگسِ غمّاز کی باتیں کرو

نام بھی لینا ہے جس کا اک جہانِ رنگ و بو　　دوستو اس نو بہار ناز کی باتیں کرو

کس لئے عذرِ تغافل کس لئے الزام عشق　　آج چرخِ تفرقہ پرداز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا　　کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

جو حیات جاوداں ہے جو ہے مرگ ناگہاں　　آج کچھ اُس ناز اس انداز کی باتیں کرو

عشق بے پروا بھی اب کچھ ناشکیبا ہو چلا　　شوخیٔ حسن کرشمہ ساز کی باتیں کرو

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق

آج اس عیسیٰ نفس دم ساز کی باتیں کرو

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی　　یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے　　نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

کہوں یہ کیسے اِدھر دیکھ یا نہ دیکھ اُدھر　　کہ درد درد ہی پھر بھی نظر نظر پھر بھی

خوشا اشارۂ پیہم زہے سکوتِ نظر　　دراز ہو کے فسانہ ہے مختصر پھر بھی

جھپک رہی ہیں زمان و مکاں کی بھی آنکھیں — مگر ہے قافلہ آمادۂ سفر پھر بھی

شبِ فراق سے آگے ہے آج میری نظر — کہ کٹ ہی جائے گی یہ شام بے سحر پھر بھی

کہیں یہی تو نہیں کاشفِ حیات و ممات — یہ حسن و عشق بظاہر ہیں بے خبر پھر بھی

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن، پلٹنا تھا — وہ کوچہ رو کشِ جنّت ہو گھر ہے گھر پھر بھی

لٹا ہوا چمن عشق ہے نگاہوں کو — دکھا گیا وہی کیا کیا گل و ثمر پھر بھی

خراب ہو کے بھی سوچا کئے ترے مہجور — یہی کہ تیری نظر ہے تری نظر پھر بھی

ہو بے نیاز اثر بھی کبھی تری مٹی — وہ کیمیا ہی سہی رہ گئی کسر پھر بھی

لپٹ گیا ترا دیوانہ گرچہ منزل سے — اڑی اڑی سی ہے یہ خاک رہگذر پھر بھی

تری نگاہ سے بچنے میں عمر گزری ہے — اتر گیا رگِ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

غم فراق کے کشتوں کا حشر کیا ہو گا؟ — یہ شامِ ہجر تو ہو جائے گی سحر پھر بھی

فنا بھی ہو کے گراں باریٔ حیات نہ پوچھ — اٹھائے اٹھ نہیں سکتا یہ دردِ سر پھر بھی

ستم کے رنگ میں ہر التفات پنہاں ہیں — کرم نما ہیں ترے جور سر بسر پھر بھی

خطا معاف ترا عفو بھی ہے مثل سزا — تری سزا میں ہے اک شانِ درگزر پھر بھی

اگرچہ بیخودیٔ عشق کو زمانہ ہوا — فراقؔ کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

مجھ کو مارا ہے ہر اک درد و دوا سے پہلے
دی سزا عشق نے ہر جرم و خطا سے پہلے

آتشِ عشق بھڑکتی ہے ہوا سے پہلے
ہونٹ جلتے ہیں محبت میں دُعا سے پہلے

فتنے برپا ہوئے ہر غنچۂ سربستہ سے
کھل گیا رازِ چمن چاکِ قبا سے پہلے

چال ہے بادۂ ہستی کا چھلکتا ہوا جام
ہم کہاں تھے ترے نقشِ کفِ پا سے پہلے

اب کمی کیا ہے ترے بے سر و سامانوں کو
کچھ نہ تھا تیری قسم ترکِ وفا سے پہلے

عشقِ بیباک کو دعوے تھے بہت خلوتمیں
کھو دیا سارا بھرم شرم و حیا سے پہلے

خود بخود چاک ہوئے پیرہنِ لالہ و گل
چل گئی کون ہوا بادِ صبا سے پہلے

ہمسفرِ راہِ عدم میں نہ ہو تاروں بھری رات
ہم پہنچ جائیں گے اس آبلہ پا سے پہلے

پردۂ شرم میں صد برقِ تبسم کے نثار
ہوش جاتے رہے نیرنگِ حیا سے پہلے

موت کے نام سے ڈرتے تھے ہم اے شوقِ حیات
تو نے تو مار ہی ڈالا تھا قضا سے پہلے

بے تکلف بھی ترا حسن خود آرا تھا کبھی
اک ادا اور بھی تھی حسنِ ادا سے پہلے

غفلتیں ہستیٔ فانی کی بتا دیں گی تجھے
جو مرا حال تھا احساسِ فنا سے پہلے

ہم انھیں پا کے فراق اور بھی کچھ کھوئے گئے
یہ تکلف تو نہ تھے عہد و وفا سے پہلے

اپنے حواس میں شبِ غم کب حیات ہے — اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

ہر کائنات سے یہ الگ کائنات ہے — حیرت سرائے عشق میں دن ہے نہ رات ہے

جینا جو آ گیا تو اجل بھی حیات ہے — اور یوں تو عمرِ خضر بھی کیا، بے ثبات ہے

کیوں انتہائے ہوش کو کہتے ہیں بیخودی — خورشید ہی کی آخری منزل تو رات ہے

ہستی کو جس نے زلزلہ ساماں بنا دیا — وہ دل قرار پائے مقدر کی بات ہے

یہ موشگافیاں ہیں گراں طبعِ عشق پر — کس کو دماغِ کاوشِ ذات و صفات ہے

توڑا ہے لامکاں کی حدوں کو بھی عشق نے — زندانِ عقل تیری تو کیا کائنات ہے

گردوں! شرارِ برقِ دلِ بے قرار دیکھ — جن سے یہ تیری تاروں بھری رات رات ہے

گم ہو کے ہر جگہ ہیں ز خود رفتگانِ عشق — ان کی بھی اہلِ کشف و کرامات ذات ہے

ہستی بجز فنائے مسلسل کے کچھ نہیں — پھر کس لئے یہ فکرِ قرار و ثبات ہے

اس جانِ دوستی کے خلوص نہاں نہ پوچھ — جس کا ستم بھی غیرتِ صد التفات ہے

یوں تو ہزار درد سے روتے ہیں بدنصیب — تم دل دکھاؤ وقتِ مصیبت تو بات ہے

عنوان غفلتوں کے ہیں فرقت ہو یا وصال — بس فرصتِ حیات فراقؔ ایک رات ہے

کوئی پیغام محبت لبِ اعجاز تو دے
موت کی آنکھ بھی کھل جائیگی آواز تو دے

مقصدِ عشق ہم آہنگی جز و کل ہے
درد ہی درد سہی دل بوئے دمساز تو دے

چشمِ مخمور کے عنوان نظر کچھ تو کھُلیں
دلِ رنجور دھڑکنے کا کچھ انداز تو دے

اک ذرا ہو نشۂ حسن میں انداز خمار
اک جھلک عشق کے انجام کی آغاز تو دے

جو چھپائے نہ چھپے اور بتائے نہ بنے
دل عاشق کو ان آنکھوں سے کوئی راز تو دے

منتظر اتنی کبھی تھی نہ فضائے آفاق
چھیڑنے ہی کو ہوں پُر درد غزل ساز تو دے

ہم اسیران قفس آگ لگا سکتے ہیں
فرصت نغمہ کبھی حسرتِ پرواز تو دے

عشق اک بار مشیت کو بدل سکتا ہے
عندیہ اپنا مگر کچھ نگہ ناز تو دے

قرب و دیدار تو معلوم کسی کا، پھر بھی
کچھ پتہ سا فلک تفرقہ پرداز تو دے

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
ابلق دہر کچھ انداز تگ و تاز تو دے

کان سے ہم تو فراق آنکھ کا لے لیتے ہیں کام
آج چھپ کر کوئی آواز پہ آواز تو دے

نگاہِ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا
حجابِ اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا

جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلووں کی
چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

دو چار برقِ تجلی سے رہنے والوں نے
فریبِ نرم نگاہی کے کھائے ہیں کیا کیا

دلوں پہ کرتے ہوئے آج آتی جاتی چوٹ
تری نگاہ نے پہلو بچائے ہیں کیا کیا

نثار نرگسِ میگوں کہ آج پیمانے
لبوں تک آئے ہوئے تھرتھرائے ہیں کیا کیا

وہ اک ذرا سی جھلک برقِ کم نگاہی کی
جگر کے زخمِ نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا

چراغِ طور جلے آئینہ در آئینہ
حجابِ برقِ ادا نے اٹھائے ہیں کیا کیا

بقدرِ ذوقِ نظر دید حسن کیا ہو مگر
نگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا

کہیں چراغ، کہیں گل، کہیں دلِ برباد
خرامِ ناز نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا

تغافل اور بڑھا اس غزالِ رعنا کا
فسونِ غم نے بھی جادو جگائے ہیں کیا کیا

ہزار فتنۂ بیدار خوابِ رنگیں میں
چمن میں غنچہ و گل رنگ لائے ہیں کیا کیا

ترے خلوصِ نہاں کا تو آہ کیا کہنا
سلوک اُچٹے بھی دل میں سمائے ہیں کیا کیا

نظر بچا کے ترے عشوہ ہائے پنہاں نے
دلوں میں دردِ محبت اٹھائے ہیں کیا کیا

پیام حسن، پیام جنوں، پیام فنا　　تری نگہ نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا
تمام حسن کے جلوے تمام محرومی　　بھرم نگاہ نے اپنے گنوائے ہیں کیا کیا

فراق راہ وفا میں سبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

کچھ بو سی اڑ رہی ہے یہ مستانہ وار کیا　　ٹپکا چمن میں شیشۂ ابر بہار کیا
اپنی نظر کا تجھ کو نہیں اعتبار کیا　　یہ بار بار پرسشِ بیگانہ وار کیا
تقلید رسم جامہ دری سے بھی ہاتھ اٹھا　　خود کو مٹا دے پیرہن تار تار کیا
پیمانۂ حیات ہے اک جام بے خودی　　یہ جس کے منہ لگا وہ رہے ہوشیار کیا
کوئی جواب دے تو خطاب و عتاب کر　　اک بے زباں کی سرزنش بار بار کیا
رنگینیٔ فضا ہے ترا عشوۂ حجاب　　ہوتا ہے اور جلوہ صبح بہار کیا
درد فراق وجہ سکوں کب ہوا اگر　　امید ہی نہ ہو تو رہیں بے قرار کیا

بجھ بجھ کے داغ دل ابھر آتے ہیں ہم نوا　　مجھ قیدیٔ قفس کی خزاں کیا بہار کیا

کچھ رنگ سا فضا سے ٹپکتا ہے اے جنوں　　چھلکا ہوا ہے شیشۂ بادِ بہار کیا

بیٹھے بٹھائے چھیڑ دیا نازِ یار کو　　یہ تونے کر دیا دلِ ناکردہ کار کیا

اے دل کسی کی پہلی نگاہوں کو بھول جا　　یاد آگیا تجھے مرے غفلت شعار کیا

سب چھوڑ ہی چکے تھے بھروسا مرا فراقؔ
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ ترا اعتبار کیا

جہانِ غنچۂ دل کا فقط چٹکنا تھا　　اسی کی بوئے پریشاں وجودِ دنیا تھا

یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا　　وہ اک نگاہ سہی کیوں کسی کو دیکھا تھا

طنابیں کوچۂ قاتل کی کھنچتی جاتی تھیں　　شہیدِ تیغِ ادا میں بھی زور کتنا تھا

بس اک جھلک نظر آئی اڑے کلیم کے ہوش　　بس اک نگاہ ہوئی خاک طورِ سینا تھا

ہر اک کے ہاتھ فقط غفلتیں تھیں ہوش نما　　کہ اپنے آپ سے بیگانہ وار جینا تھا

یہی ہوا کہ فریبِ امید و یاس مٹے　　وہ پا گئے ترے ہاتھوں ہمیں جو پانا تھا

چمن میں غنچۂ گل کھلکھلا کے مرجھائے — یہی وہ تھے جنھیں ہنس ہنس کے جان دینا تھا

نگاہِ مہر میں جس کی ہیں صد پیامِ فنا — اسی کا عالم ایجاد ناز بیجا تھا

جہاں تو جلوہ نما تھا لرزتی تھی دنیا — ترے جمال سے کیسا جلال پیدا تھا

حیات و مرگ کے کچھ راز کھل گئے ہونگے — فسانۂ شبِ غم ورنہ دوستو کیا تھا

شبِ عدم کا فسانہ گدازِ شمعِ حیات — سوائے کیف فنا میرا ماجرا کیا تھا

کچھ ایسی بات نہ تھی تیرا دور ہو جانا — یہ اور بات کہ رہ رہ کے درد اٹھتا تھا

نہ پوچھ سود و زیاں کاروبارِ الفت کے — وگرنہ یوں تو نہ پانا تھا کچھ نہ کھونا تھا

لگاوٹیں وہ ترے حسن بے نیاز کی آہ — میں تیری بزم سے جب ناامید اٹھا تھا

تجھے ہم اے دلِ درد آشنا کہاں ڈھونڈیں — ہم اپنے ہوش میں کب تھے کوئی جب اٹھا تھا

عدم کا راز صدائے شکست سازِ حیات — حجاب زیست بھی کتنا لطیف پردا تھا

یہ اضطراب و سکوں بھی تھے اک فریبِ حیات — کہ اپنے حال سے بیگانہ وار جینا تھا

کہاں یہ چوک ہوئی تیرے بیقراروں سے — زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا

یہ کوئی یاد ہے یہ بھی ہے کوئی محویت — ترے خیال میں تجھ کو بھی بھول جانا تھا

کہاں کی چوٹ اُبھر آئی تھی حسن تاباں میں
دمِ نظارہ وہ رخ دردسا چمکتا تھا

نہ پوچھ رمز و کنایات چشمِ ساقی کے
بس ایک حشر خموش انجمن میں برپا تھا

چمن چمن تھی گل داغ عشق سے ہستی
اسی کی نکہت برباد کل زمانا تھا

وہ تھا مرا دل خوں گشتہ جس کے مٹنے سے
بہار باغ جناں تھی وجود دُنیا تھا

قسم ہے بادہ کشو چشم مست ساقی کی
بتاؤ ہاتھ سے کیا جام مے سنبھلتا تھا

وصال اس سے میں چاہوں کہاں یہ دل میرا
یہ رو رہا ہوں کہ کیوں اُسکو میں نے دیکھا تھا

اُمید یاس بنی یاس پھر اُمید بنی
اس اک نظر میں فریب نگاہ کتنا تھا

یہ سوز و ساز نہاں تھا وہ سوز و ساز عیاں
وصال ہجر میں بس فرق تھا تو اتنا تھا

شکستِ سازِ چمن تھی بہار لالہ و گل
خزاں مچلتی تھی غنچہ جہاں چٹکتا تھا

ہر ایک سانس ہی تجدید "یاد ایام"
گزر گیا وہ زمانہ جسے گزرنا تھا

نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقیں نہ کوئی امید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

کسی کے صبر نے بے صبر کر دیا سب کو
فراقؔ نزع میں کروٹ کوئی بدلتا تھا[1]

[1] عین جوانی میں اپنے بڑے بھائی کی موت دیکھ کر یہ شعر کہا تھا۔ (فراقؔ)

قہر ہے تیرا یا تری رحمت   عشق محبت ، الفت، چاہت

چھوڑ یہ بحثِ مجاز و حقیقت   پہلے محبت سیکھ محبت

تیری صورت میری طبیعت   یہ بھی کہانی وہ بھی حکایت

دنیا کی بدلی جو حالت   حسن بھی بھولا ناز و نزاکت

اک مدت سے ہے اب تو یہ حالت   ہوش نہ غفلت رنج نہ راحت

سیدھی قسمت ٹیڑھی قسمت   سب کا علاج ہے درد محبت

ایک دیس کے نام ہیں دونوں   دوزخ کہئے اُسے یا جنّت

حسن ہے بے بس دیکھ کے تجھ کو   اے دل مضطر غیرت غیرت

عشق عذاب ضرور ہے لیکن   اس سے بچنے کی کوئی صورت

حسن کا دل بھی بھر آتا ہے   پھر بھی ہوں شاداں اُف ری طبیعت

دیکھیں رہے یہ رنگ بھی کب تک   گھٹتی محبت ، بڑھتی مروّت

ایک ہی وقت میں خوش بھی غمیں بھی   یہ بھی ہے اک شانِ محبّت

آج تمھیں دل کو سمجھاؤ   میری تو پڑتی نہیں ہمّت

ایک عشق اور اتنے دشمن ایک مصیبت لاکھ مصیبت
کیا کہنا تجھ کو گر ملتی تیری صورت میری طبیعت
رہگذر عشاق رہی ہے دوزخ دوزخ جنت جنت
حسن ہی ہے یا کچھ اے دل جانِ عشق ایمان محبت
سوچ رہا ہوں زمانہ گزرا کھائے ہوئے فریب محبت
عشق ابھی سے تنہا تنہا ہجر کی بھی آئی نہیں نوبت

کچھ تو نے بھی سنا؟ کہتے ہیں
اور ہے اب تو فراق کی حالت

ترا جمال بھی ہے آج اک جہانِ فراق نگاہِ لطف و کرم خود ہی ترجمانِ فراق
فضا جہانِ محبت کی جن سے تھی رنگیں تجھے بھی یاد کچھ آئے وہ شادمانِ فراق
نظر بچا کے جنھیں برقِ حسن چھوڑ گئی ملے نہ زخمِ نہاں میں بھی وہ نشانِ فراق

نگاہِ ناز تری تھی تمام قول و قسم — کسی کو ہو بھی نہ سکتا تھا کچھ گمانِ فراق

رُلا گئی ترے آسودگانِ خاک کی یاد — وہ بے نیازِ محبت وہ رازدانِ فراق

اُٹھے ہیں تیغِ تغافل کے کھول کر جوہر — نہ کیوں ہوں زندۂ جاوید کشتگانِ فراق

تبا تو کیا نگہ اولیں کے بعد ہوا — مجھے بھی یاد ہے کم کم وہ داستانِ فراق

امید بن کے نہ آئے دلوں کی دنیا میں — اسے سمجھ نہیں سکتے یہ بدگمانِ فراق

وہ بیقراریٔ دل وہ فضائے تنہائی — وہ سرزمینِ محبت وہ آسمانِ فراق

گداز دل سے حقیقت سرشکِ غم کی نہ پوچھ — ہر ایک قطرہ تھا اک بحرِ بیکرانِ فراق

جسے مٹا نہ سکی برقِ کم نگاہیٔ حسن — وہی اُمید کی دنیا ہے پاسبانِ فراق

خود آشنا نہیں اُن سے حریمِ تنہائی — یہ سوز و ساز ہیں ناخواندہ میہمانِ فراق

سکونِ قرب سے کچھ بیقرار تنگ آ کر — سنا ہے ڈھونڈھتے پھرتے ہیں امانِ فراق

خبر کچھ اُن کو نہیں اب ترے تغافل کی — بس آج چین سے سوئے بلاکشانِ فراق

جو ایک برقِ نگہ سامنے سے کوند گئی

وہی تھی روحِ محبت وہی ہے جانِ فراق

میں نے دیکھی ہیں یہ آنکھیں مست وافسوں گر کہاں
ساقیا چھوٹا تھا میرے ہاتھ سے ساغر کہاں

یوں اُترتی جانے والی اے نگاہ شرمگیں
ڈوب کر دیکھیں نکلتا ہے ترا نشتر کہاں

رہروانِ کوئے جاناں آہ اتنی ٹھوکریں
ہم نے بھی بے دست و پا ہوکے کیا بستر کہاں

اے جنوں اب حال گلزارِ خزاں دیدہ نہ پوچھ
وہ نسیم صبح کے جھونکے چمن پرور کہاں

یاد ہیں لب ہائے جاناں کی تبسم ریزیاں
بات وہ تجھ میں بھلا موجِ مئے کوثر کہاں

خون تھا کلیوں کا دل بادِ صبا بے چین تھی
جلوۂ گلزار ڈوبے تھے ترے نشتر کہاں

جامِ دل کی تہہ میں موجِ خوں سی اٹھ کر رہ گئی
اپنی قسمت میں کوئی چھلکا ہوا ساغر کہاں
آنکھیں بھر آتی ہیں اکثر پچھلی شب کو اے فراقؔ
وہ خماریں چشمِ ساقی وہ بھرے ساغر کہاں

بستیاں ڈھونڈھ رہی ہیں انھیں ویرانوں میں
وحشتیں بڑھ گئیں حد سے ترے دیوانوں میں
نگہِ ناز نہ دیوانوں نہ فرزانوں میں
جانکار ایک وہی ہے مگر انجانوں میں
بزمِ مے بے خود و بے تاب نہ کیوں ہو ساقی
موجِ بادہ ہے کہ درد اٹھتا ہے پیمانوں میں
میں تو میں چونک اٹھی ہے یہ فضائے خاموش
یہ صدا کب کی سنی آتی ہے پھر کانوں میں

وسعتیں بھی ہیں نہاں تنگئ دل میں غافل
جی بہل جاتے ہیں اکثر انھیں میدانوں میں

جانِ ایمانِ جنوں سلسلہ جنبانِ جنوں
کچھ کشش ہائے نہاں جذب ہیں ویرانوں میں

خندۂ صبحِ ازل تیرگئ شامِ ابد
دونوں عالم ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

دیکھ جب عالمِ ہُو کو تو نیا عالم ہے
بستیاں بھی نظر آنے لگیں ویرانوں میں

جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اُٹھے
گرمیاں ہیں ابھی کچھ سوختہ سامانوں میں

وحشتیں بھی نظر آتی ہیں سرِ پردۂ ناز
دامنوں میں ہے یہ عالم نہ گریبانوں میں

ایک رنگینئ ظاہر ہے گلستاں میں اگر
ایک شادابئ پنہاں ہے بیابانوں میں

جو ہر غنچہ و گل میں ہے اک اندازِ جنوں
کچھ بیاباں نظر آئے ہیں گریبانوں میں
اب وہ رنگِ چمن و خندۂ گل بھی نہ رہے
اب وہ آثار جنوں بھی نہیں دیوانوں میں
اب وہ ساقی کی بھی آنکھیں نہ رہیں رندوں سے
اب وہ ساغر بھی چھلکتے نہیں میخانوں میں
اب وہ اک سوزِ نہانی بھی دلوں میں نہ رہا
اب وہ جلوے بھی نہیں عشق کے کاشانوں میں
اب نہ وہ رات جب اُمیدیں بھی کچھ تھیں تجھ سے
اب نہ وہ بات غمِ ہجر کے افسانوں میں
اب ترا کام ہے بس اہلِ وفا کا پانا
اب ترا نام ہے بس عشق کے غم خانوں میں
تابکے وعدۂ موہوم کی تفصیل فراق
شبِ فرقت کہیں کٹتی ہے اِن افسانوں میں

دورِ افلاک کا شباب ہے تو — آشنا بوں کا آفتاب ہے تو

ٹھہری ٹھہری سی موج برق جمال — چھلکی چھلکی شرابِ ناب ہے تو

جس کی راتیں طلسم خواب حیات — اسی وادی کا ماہتاب ہے تو

جن میں ہے ذکر طور و یوسف و حشر — انھیں آیات کا جواب ہے تو

روپ ایسا حسین جیسے گناہ — خلق کا حاصل ثواب ہے تو

جو چھلکتا بھی جائے بھرتا بھی جائے — ایسا پیمانۂ شراب ہے تو

نرم جھنکار سازِ قامت کی — اک کھٹکتا ہوا رباب ہے تو

تو جو صورت پکڑ لے ہو وہ خیال — یک بیک جاگ اُٹھے وہ خواب ہے تو

ہیں جو اُوجھل نگاہ غیب سے بھی — اِن فضاؤں میں باریاب ہے تو

جو بہاروں کے دل سے اٹھتے ہیں — انھیں شعلوں کا پیچ و تاب ہے تو

ہیں عبارت تجھی سے رنج و نشاط — ستم و لطف بے حساب ہے تو

طور ساماں لجانے کے انداز — رشک جلوہ ہے وہ حجاب ہے تو

چمن اندر چمن ہے پہلوئے ناز — کس کھلے باغ کا گلاب ہے تو

یہ ستارے ترے پسینے کے — شب کا دہکا ہوا شباب ہے تو

عکس ہے نکر چاندنی تیرا — دہکی راتوں کا ماہتاب ہے تو
پگھلی چاندی میں شعلوں کی کروٹ — موجِ برقِ تہہِ سحاب ہے تو
موجزن نرمئ صباحتِ حسن — سینۂ کہکشاں کا خواب ہے تو
اُف یہ مہکی ہوئی سہانی رات — چہرۂ شب کی آب وتاب ہے تو
اور پنہاں ہے حسن بے پردہ — اور پیدا تہہِ نقاب ہے تو
جیسے زیرِ شفق چراغاں ہو — آج یوں مائلِ حجاب ہے تو
تجھ سے جوبن اجالی راتوں پر — ماہتابوں کا ماہتاب ہے تو
رنگ اس ادھ کھلے شگوفوں کا — مسکراتا ہوا شباب ہے تو
جن پہ پڑتی نہیں خزاں کی چھاؤں — ان بہاروں کی آب وتاب ہے تو
آنکھ پڑتی ہے اک زمانے کی — بزمِ امکاں میں انتخاب ہے تو
چشمِ مخمور پہ مے آشامی — انھیں باتوں سے تو خراب ہے تو

جیسے نغمے لبِ فراق پہ سوئیں
تیسح پہروں ہی محوِ خواب ہے تو

طرزِ میر

فرقت کی غمگیں راتوں کو یاد میں تیری رولیں ہیں
تاروں کو جب نیند آئے ہے ہم بھی گھڑی بھر سولیں ہیں

ساقی بھلا کہاں قسمت میں اب وہ چھلکتے پیمانے
ہم یادوں کے جام چوم کے سوکھے ہونٹ بھگولیں ہیں

نظرت کی وہ آنکھ مچولی دید کے قابل ہوئے ہے
عالمِ راز میں کلیاں آنکھیں بند کریں ہیں کھولیں ہیں

بے قصور منصور کو ناحق دار و رسن پر کھینچو ہو
لوگو کوئی اور نہیں یہ پردے سے ہم بولیں ہیں

لاکھ لاکھ ہم ضبط کریں ہیں دل ہے کہ اُمنڈا آوے ہے
ہمدم آنکھیں بھر آئیں ہیں نام بھی اس کا جو لیں ہیں

پتہ پتہ بوٹا بوٹا وجد کرے ہے گلشن میں
جب مشرق میں شفق پھولے ہے نرم ہوائیں ڈولیں ہیں

کون کرے ہے باتیں مجھ سے تنہائی کے پردے میں
ایسے میں کس کی آوازیں کانوں میں رس گھولیں ہیں

جچی تلی میزانِ نظر ہے کیا مجال جو فرق پڑے
آنکھوں آنکھوں میں وہ دلوں کو رتی رتی تولیں ہیں

حسن کے ہاتھوں جب کہیں جا کر کوئی سُرخ رُو ہوے ہے
اہلِ وفا پہلے اپنا منھ اپنے لہو سے دھولیں ہیں

اب اکثر بیمار رہیں ہیں کہیں نہیں نکلیں ہیں فراقؔ
حال چال لینے ان کے گھر کبھو کبھو ہم ہولیں ہیں

نورس غنچے پنکھڑیوں کی نازک گرہیں کھولیں ہیں
یا اڑجانے کو رنگ و بو گلشن میں پر تولیں ہیں

تارے آنکھیں جھپکا دیں ہیں ذرّہ ذرّہ سوئے ہے
تم بھی سنو ہو یارو شب میں سناٹے کچھ بولیں ہیں

ہم ہوں یا قسمت ہو ہماری دونوں کو ایک ہی کام ملا
قسمت ہم کو رولیوے ہے ہم قسمت کو رولیں ہیں

جو مجھ کو بدنام کریں ہیں وے کاش اتنا سوچ سکیں
میرا پردا کھولیں یا اپنا پردا کھولیں ہیں

یہ قیمت بھی ادا کریں ہیں ہم بہ درستی ہوش و حواس
تیرا سودا کرنے والے دیوانہ بھی ہولیں ہیں

تیرے غم کا پاس ادب ہے کچھ دنیا کا خیال بھی ہے
سب سے چھپا کے درد کے مارے چپکے چپکے رولیں ہیں

فطرت کا قائم ہے توازن عالم حسن و عشق میں بھی
اس کو اتنا ہی پا دیں ہیں خود کو جتنا کھولیں ہیں

آب و تابِ اشعار نہ پوچھو تم بھی آنکھیں رکھو ہو
یہ جگ مگ بیتوں کی دمک ہے یا ہم موتی رولیں ہیں

ایسے میں تو یاد آئے ہے انجمن مے میں رندوں کو
رات گئے گردوں پہ فرشتے باب گنہ جب کھولیں ہیں

صدقے فراقؔ اعجاز سخن کے کیسے اڑا لی یہ آواز
ان غزلوں کے پردوں میں تو میرؔ کی غزلیں بولیں ہیں

اب اکثر چپ چپ سے رہیں ہیں یونہی کبھو لب کھولیں ہیں
پہلے فراقؔ کو دیکھا ہوتا اب تو بہت کم بولیں ہیں

دن میں ہم کو دیکھنے والو اپنے اپنے ہیں اوقات
جاؤ نہ تم ان خشک آنکھوں پر ہم راتوں کو رو لیں ہیں

فطرت میری عشق و محبت قسمت میری تنہائی
کہنے کی نوبت ہی نہ آئی ہم بھی کسو کے ہو لیں ہیں

خنک سیہ مہکے ہوئے سائے پھیل جائیں ہیں جل تھل پر
کن جتنوں سے میری غزلیں رات کا جوڑا کھولیں ہیں

باغ میں وہ خواب آور عالم موج صبا کے اشاروں پر
ڈالی ڈالی نورس پتے، سہج، سہج جب ڈولیں ہیں

اُف وہ لبوں پر موج تبسّم جیسے کروٹیں لیں کوندے
ہائے وہ عالمِ جنبشِ مژگاں جب فتنے پر تولیں ہیں

نقش و نگارِ غزل میں جو تم یہ شادابی پاؤ ہو
ہم اشکوں میں کائنات کے نوکِ قلم کو ڈبولیں ہیں

ان راتوں کو حریمِ ناز کا اک عالم ہوئے ندیم
خلوت میں وہ نرم انگلیاں بندِ قبا جب کھولیں ہیں

غم کا فسانہ سننے والو آخرِ شب آرام کرو
کل یہ کہانی پھر چھیڑیں گے ہم بھی ذرا اب سولیں ہیں

ہم لوگ اب تو اجنبی سے ہیں کچھ تو بتاؤ حالِ فراقؔ
اب تو تمھیں کو پیار کریں ہیں اب تو تمھیں سے بولیں ہیں

ہم سے فراق اکثر چھپ چھپ کر پہروں پہروں روؤ ہو
وہ بھی کوئی ہمیں جیسا ہے کیا تم اس میں دیکھو ہو

جن کو اتنا یاد کرو ہو چلتے پھرتے سائے تھے
ان کو مٹے تو مدت گزری نام و نشاں کیا پوچھو ہو

جانے بھی دو نام کسی کا آگیا باتوں باتوں میں
ایسی بھی کیا چپ لگ جانا کچھ تو کہو کیا سوچو ہو

پہروں پہروں تک یہ دنیا بھولا سپنا بن جائے ہے
میں تو سراسر کھو جاؤں ہوں یاد اتنا کیوں آؤ ہو

کیا غم دوراں کی پرچھائیں تم پر بھی پڑ جائے ہے
کیا یاد آجائے ہے یکایک کیوں اداس ہو جاؤ ہو

چھوٹی شکایت بھی جو کروں ہو پلک دیپ جل جائیں ہیں
تم کو چھیڑے بھی کیا تم تو ہنسی ہنسی میں رو دو ہو

غم سے خمیر عشق اٹھا ہے حسن کو دیویں کیا الزام
اُس کے کرم پر اتنی اُداسی دل والو کیا چاہو ہو

ایک شخص کے مرجائے سے کیا ہو جائے ہے لیکن
ہم جیسے کم ہوئیں ہیں پیدا پچھتاؤ گے دیکھو ہو

اتنی وحشت اتنی وحشت صدقے اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرن ہو میں نہ شکاری دور اتنا کیوں بھاگو ہو

میرے نغمے کس کے لئے ہیں خود مجھ کو معلوم نہیں
کبھی نہ پوچھو یہ شاعر سے تم کس کا گن گاؤ ہو

پلکیں بند السائی زلفیں نرم سیج پر بکھری ہوئی
ہونٹوں پر اک موجِ تبسم سوؤ ہو یا جاگو ہو

اتنے تپاک سے مجھ سے ملو ہو پھر بھی یہ غیریت کیوں
تم جیسے یاد آؤ ہو برابر میں ہوں وہی تم بھولو ہو

کبھی نبادو ہو سپنے کو جادوں سی رشک گلزار
کبھی بہ رنگ رخ بن کر تم یاد آتے ہی اُڑ جاؤ ہو

گاہ ترس جائیں ہیں آنکھیں رسجل روپ کے درشن کو
گاہ نیند بن کے راتوں کو نین پٹوں میں آؤ ہو

اس دنیا ہی میں ہے سینں ہیں اک دنیائے محبت بھی

ہم بھی اسی جانب جاویں ہیں یو تو تم بھی آؤ ہو

بہت دنوں میں یاد کیا ہے بات بنائیں کیا اُن سے

جیون ساتھی دکھ پوچھیں ہیں کس کو ہیں تم سونپو ہو

چپ چپ سی ہے فضائے محبت کچھ نہ کہے ہے خلوتِ راز

نرم اشاروں سے آنکھوں کے بات کہاں پہونچاؤ ہو

ابھی اسی کا انتظار تھا۔ اور کتنا اے اہلِ وفا

چشم کرم جب اٹھنے لگی ہے تو اب تم شرماؤ ہو

غم کے ساز سے چنچل انگلیاں کھیل رہی ہیں رات گئے

جن کا سکوت ابد ہے دے پردے کیوں چھیڑو ہو

کچھ تو بتاؤ رنگ روپ بھی تم اس کا اے اہلِ نظر

تم تو اس کو جب دیکھو ہو دیکھتے ہی رہ جاؤ ہو

اکثر گہری سوچ میں ان کو کھویا کھویا پاویں ہیں

اب ہے فراق کا کچھ روزوں سے جو عالم کیا پوچھو ہو

نظمیں

تلاش حیات

اہل ہند کے نام سال نو ۴۸ء کا پیام

مہر کے گرد یہ زمیں کر چکی اک طواف اور
قلب زماں مکاں میں آج پڑ گیا اک شگاف اور

گنگ و جمن نے کروٹیں بدلیں چمکتے درد سے
ہلتی ہیں رات کی لٹیں موجِ ہوائے سرد سے

ایک چھپی ہوئی لکیر شرق سے دے رہی ہے لو
کانپتے ہیں کرن کے تیر چرخ پہ پھوٹ رہی ہے پو

جان فضا میں پڑ چلی سینوں سے وہ اُٹھا دھواں
رات کٹی ، سحر ہوئی دوڑیں رگوں میں بجلیاں

جن پہ گراں جمود تھا ذرّے وہ تلملا اُٹھے
جھوم کے چل پڑی ہوا غنچے بھی مُسکرا اُٹھے

خواب سے آبشاروں نے چونک کے آنکھیں کھول دیں
چشمے اُچھل اُچھل پڑے نہریں اُبل اُبل پڑیں

سو گئی تھی پڑے پڑے جیسے ہو ماتی نیند کی
خوابِ گراں سے موت کے جاگ اٹھی ہے زندگی

ہند کے گھونگھٹوں تلے کتنی سہانی آگ ہے
صبح کو ماں کے ماتھے پر آج بنا سہاگ ہے

آج وطن کے نو نہال پھر سے ہیں مائل سفر
آنکھوں میں ہیں وہ ماہ و سال غیب ہے جن سے بے خبر

اُٹھ پڑے ہو تو اہل ہند بڑھتے ہی رہنا کام ہے
کھوٹی نہ ہو رہِ حیات تم سے یہی پیام ہے

نیل گگن کی چوٹیاں تم کو بلا رہی ہیں آج
سازِ حیات وادیاں تم کو سُنا رہی ہیں آج

پوچھو نہ اہلِ کارواں اگلا کہاں پڑاؤ ہے
ہوں گے نہ جانے کل کہاں آج تو چل چلاؤ ہے

سوچو نہ جی میں یہ کہیں ٹھاؤں ملے تو بیٹھ جائیں
زیر سما و بر زمیں چھاؤں ملے تو بیٹھ جائیں

نام مقام کا نہ لو بڑھتے ہی جاؤ صبح و شام
نام قیام کا نہ لو تم ہو مسافرِ دوام

یاد رہے تمھیں کہ تم ہند کی زندہ خاک ہو
تم پہ ہوں رحمتیں کہ تم خاک بھی ہو کے پاک ہو

دیکھیے کاروانوں کو آتی ہیں کب وہ منزلیں
چرخ سے بدگمانوں کو اپنے جہاں پتے ملیں

سینے میں آگ، ہاتھ میں لے کے عنانِ دو جہاں
کون و مکاں ہیں ساتھ میں بڑھتا چلا ہے کارواں

منزلیں کاٹتے چلو راہ رَوو بڑھے چلو
نغمہ بلب بڑھے چلو رقصِ کُناں چلے چلو

کھوٹی نہ ہو رہِ وفا جو بھی پڑے سہے چلو
آنکھوں میں کاٹنی ہے رات قصۂ غم کہے چلو
ہوش چھٹا تو غم نہیں جھومتے جھاتے چلو
جیب سکون و صبر کو پھاڑے چلو سیے چلو
پھول نہیں تو داغوں سے دامنِ دل بھرے چلو
تاروں کو چھیڑتے بڑھو خاک بھی چھانتے چلو
موت ملے جو راہ میں موت کو بھی لئے چلو
اٹھ پڑو آندھیوں کی طرح سیل نما بڑھے چلو
دل نہیں تم کہ بیٹھ جاؤ دردِ ہو تم اُٹھے چلو
آبِ خضر ہے بوند بوند جام اجل پیئے چلو
اپنے ہی دل کی آگ میں ڈوبتے تیرتے چلو

تلوؤں سے ٹھنڈی دھرتی کو آنچ سی کچھ دئے چلو
راہ سفر کے ذرّوں کو اذنِ حیات دئے چلو

ہاں یوں ہی آنکھوں آنکھوں میں موت کو تولتے چلو
کون و مکاں کی سرحدیں توڑتے تاڑتے چلو
سوکھی ہیں زیست کی جڑیں اشکوں سے سینچتے چلو
نخلِ مراد کو یوں ہی آبِ حیات دیئے چلو
چاند سے کیفِ رمزیت رات سے چھینتے چلو
موت کی نیند اُچاٹ دو قم کی صدا دیے چلو
عمق میں بطن گیتی کے حیات ڈھونڈتے چلو
ممات کے بھی اُوٹ میں حیات ڈھونڈتے چلو

مسل گیا ہے چرخ داہیوں سے جو دلِ تپاں
ہنوز لو سی دے رہی ہیں تاروں کی بھی چٹکیاں

یمن یمن، عدن عدن کلی کلی، چمن چمن
بسوزِ عشق شعلہ زن بسازِ حسن گل بدن

بہ مشکِ آہوئے ختن   بہ گیسوئے شکن شکن
بہ شیریں و بہ کوہ کن   بہ داستانِ نل دمن
بہ نرگس پیالہ زن   بروئے صاعقہ فگن
بہ ہر نفس، بہ ہر سخن   بہ ہائے و ہوئے ما و من
زمیں زمیں، زمن زمن   سفر سفر، وطن وطن
بَدیر ساز و بُت شکن   بہ ذوقِ شیخ و برہمن
بہ حق بہ کفر شعلہ زن   بہر خدا و اہرمن

حیات ڈھونڈھتے چلو

حیات ڈھونڈھتے چلو

صدائے صلح و جنگ میں   سکوت خاک و سنگ میں
جہانِ رنگ رنگ میں   اُمنگ میں ترنگ میں
جوانیوں کی آگ میں   محبتوں کے راگ میں
لگاؤ اور لاگ میں   حسینوں کے سہاگ میں
شفق شفق جمال میں   اُڑے اُڑے گلال میں

فراق میں وصال میں طواف ماہ و سال میں

جھکی پلک کی چھاؤں میں

رسیلی نرم اداؤں میں

خنک خنک ہواؤں میں ستاروں کی سبھاؤں میں

دھواں دھواں گھٹاؤں میں گھلی گھلی فضاؤں میں

اندھیری گھپ گپھاؤں میں جو ڈس لیں ان بلاؤں میں

حیات ڈھونڈھتے چلو

حیات ڈھونڈھتے چلو

افق افق جبینوں میں

چراغ پاش سینوں میں

چمن چمن حسینوں میں جناں کے نازنینوں میں

دلوں کے آبگینوں میں جبیں کی نرم چینوں میں

زمین کے دفینوں میں دل فلک کے کینوں میں

اندھیری کائناتوں میں سیاہ پوش راتوں میں
جھکی نظر کی باتوں میں اجل کی گہری گھاتوں میں
چھٹکنے والے زہر میں چڑھنے والی لہر میں
چھٹکنے والے زہر اور چڑھنے والی لہریں
ہر ایک جبر اور ڈھائے جانے والے قہر میں
حیات ڈھونڈھتے چلو
حیات ڈھونڈھتے چلو

شفق کے مسکرانے میں سحر کے گنگنانے میں
صبا کے جھوم جانے میں کلی کے رسمسانے میں
حیا کے رنگ لانے میں کسی کے منہ چھپانے میں
سرشک ڈبڈبانے میں دلوں کے بیٹھ جانے میں
فلک کے قہر ڈھانے میں قیامتیں اُٹھانے میں
سما کے نرم لوچ میں شجر حجر کے سوچ میں

حیات ڈھونڈتے چلو

حیات ڈھونڈتے چلو

بہ مستی و بہ کیف و کم　　بہر نشاط و ہر الم
جہاں جہاں، عدم عدم　　جُدا جُدا، بہم بہم
ارم ارم، حرم حرم　　خدا خدا، صنم صنم
بصوتِ نغمہ دم بہ دم　　بہ مدوجزر زیر و بم
بہ خلوت و بجلوہ گہ　　بہر ادا بہر نگہ
بہ میکدہ و بارگہہ
بہر ثواب و ہر گنہ

گناہ میں ثواب میں جحیم و خلد زار میں
جمالِ شرمسار میں نگاہ بے قرار میں
لبِ شگوفہ کار کے سکوتِ نغمہ بار میں
ہرے بھرے چمن کے اضطراب شعلہ دار میں

نکلتے بیٹھتے دنوں کے کیف بے خمار میں
لہکتے سبزہ زار میں ہوائے جوئے بار میں
تبسم شرار میں ترنم ھزار میں
بہار میں جنون کی قبائے تار تار میں
صنم کدہ بدوش اس ادائے پیکر نگار میں
وہ ساتگیں بدست نرگسِ سیاہ کار میں

لچکتی سی کمان کامدیو کے شکار میں
غمِ فراق یار اور حال سوگوار میں
قضا کی ہر سنوار اور قسمتوں کی مار میں
نشاط خیز نعرہ اور دکھ بھری پکار میں
جہاں کے گرم سرد میں خزاں میں اور بہار میں
ہر ایک لالہ زار میں ہر ایک دشتِ خار میں
بہار کے نکھار میں شباب کے ابھار میں

اُبھرتے جوبن اور لہلہاتے قدِ یار میں
بھوؤں کی لوچ، مارتی اُپی اُپی کٹار میں
سیاہ حلقہ حلقہ زلف کے بنفشہ زار میں
جمالِ مہ چکاں و عشوۂ ستارہ بار میں
سرکتے کھنچتے گھونگھٹوں میں شوخیِ نگار میں
اَدا اَدا کے گرد سات رنگ کی پھوار میں
اُمنڈتے سیلِ نغمہ کے سکونِ بے قرار
چڑھاؤ میں اُتار میں نشے اور خمار میں
ہر ایک کار زار میں ہر ایک جیت ہار میں

حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو

کلی کی چٹکیوں میں
سُنبلِ چمن کے طرہ میں حیات ڈھونڈتے چلو

دھڑکتے قلب قطرہ

اور سانس لیتے ذرہ میں حیات ڈھونڈتے چلو

جہانِ عنصری کے

کاروبار روز مرّہ میں حیات ڈھونڈتے چلو[1]

بھری بھری گھٹاؤں میں فضا کی وہ اُداہٹیں

دُھلی ہوئی ہوا میں زلف شب کی تھرتھراہٹیں

سکوت میں کسی کے پائے ناز کی وہ آہٹیں

گجر سے پہلے کائنات کی وہ کنمناہٹیں

وہ پو پھٹی جبین چرخ کی وہ جگمگاہٹیں

وہ رسمساتے گلشنِ سحر کی لہلہاہٹیں

کچھ اُودی بدلیوں میں دھوپ کی وہ مسکراہٹیں

صبوحی پی کے روئے لالہ گوں کی تمتماہٹیں

[1] میں نے ان قافیوں کو یہاں جائز قرار دے لیا ہے۔ (فراق)

شگوفہ چھوڑتی جوانیوں کی اچپلاہٹیں
لبوں کی پنکھڑی پہ تاروں کی وہ جھلملاہٹیں
وہ مد میں ڈوبے سینوں کی رسیلی گنگناہٹیں
نگاہِ شرمسار کی کرن کی لپ‌لپاہٹیں
ردائے روز و شب کی وہ خموش سرسراہٹیں
ہوائے انقلاب کے پروں کی پھڑپھڑاہٹیں
چراغِ نظمِ کہنہ کی اُداس ٹمٹماہٹیں
زمیں کی تہوں میں زلزلوں کی گڑگڑاہٹیں
نظامِ کائنات کی رگوں کی سنسناہٹیں
جہاں فگن پیالے میں اندھیرے میں اُجالے میں
دہکتے آگ مالے میں جوانیوں کے ہالے میں
جبینوں کے اُجالے میں سیاہ لٹ کے کالے میں
کتھا کلی کے سوچ میں
کلائیوں کی موچ میں

فضا کی نرم سانس میں
ہر اک کھٹکتی پھانس میں

بسوز نفع و زیاں — بدرد و سعیٔ رائیگاں
بہ ارض اور بہ آسماں — زماں زماں، مکاں مکاں
برنگ سیلِ کارواں — رواں دواں رواں دواں
مثالِ برق بے اماں — تپاں تپاں دماں دماں
بسازِ قلبِ عاشقاں — بسوزِ سینۂ تپاں
بہر عیاں و ہر نہاں — یقیں یقیں گماں گماں
بشش جہات و لامکاں — اِدھر اُدھر یہاں وہاں
بسازِ دل بسوزِ جاں — بہ نیک و بد بہ این و آں
بہر تپہ و ہر نشاں — بہ ماندگاں و رفتگاں
بعزمِ عمرِ جاوداں — بہ رزم مرگِ ناگہاں

دلوں کی دہکی آگ میں — جنوں کی مڑتی باگ میں

جوانیوں کی آہ میں جمال بے پناہ میں
نگاہِ دل نواز میں دلوں کے ساز باز میں

نگارِ بے نیاز کی اداے دلنواز میں دلوں کے ساز باز میں
لجاتے مسکراتے آ ہوئے بہانہ ساز میں نگاہِ نیم باز میں
صد انتشار غزنوی و گیسوے ایاز میں نیاز اور ناز میں
نہ کٹنے والی ہجر یار کی شبِ دراز میں دلوں کے سوز و ساز میں
پلک کی اوٹ سے اشارۂ نگاہ ناز میں جنوں کی ترک تاز میں
جمال رنگ رنگ و نرگس کرشمہ ساز میں گناہ کے جواز میں
شعاع تیز و تند سے فضاؤں کے گداز میں ہوائے بادہ ساز میں
ہر اک کھنکتے ساز میں ہر انکشاف و راز میں حقیقت و مجاز میں
سمندروں کی تہ میں آسمانوں کے فراز میں ہر اک جہانِ راز میں

ہر اک غم اور شادی میں
فلک، ق وادی وادی میں

حیات ڈھونڈھتے چلو حیات ڈھونڈتے چلو

بیس برس کے اُس نوجوان کے جذبات
جس کی ماں اُسی دن مر گئی جس دن وہ پیدا ہوا

یہ مست مست گھٹا، یہ بھری بھری برسات

تمام — حدِ نظر تک — گھلاوٹوں کا سماں

فضائے شام میں ڈورے سے پڑتے جاتے ہیں

جدھر نگاہ کریں کچھ دھواں سا اٹھتا ہے

دہک اٹھا ہے طراوت کی آنچ سے آکاش

ز فرش تا فلک انگڑائیوں کا عالم ہے

یہ مدبھری ہوئی پروائیاں سنکتی ہوئی

جھنجھوڑتی ہے ہری ڈالیوں کو سرد ہوا

یہ شاخسار کے جھولوں میں پینگ پڑتے ہوئے

یہ لاکھوں تپیوں کا ناچنا یہ رقصِ نبات

یہ بے خودیٔ مسرت یہ والہانہ رقص

یہ تال سم، یہ چھماچھم ـــــ کہ کان بجتے ہیں

ہوا کے دوش پہ کچھ اودی اودی شکلوں کی

نشے میں چور سی پرچھائیاں تھرکتی ہوئی

اُفق پہ ڈوبتے دن کی جھپکتی ہیں آنکھیں

خموش سوزِ دروں سے سلگ رہی ہے یہ شام!

مرے مکان کے آگے ہے ایک چوڑی صحن وسیع

کبھی وہ ہنستی نظر آتی ہے کبھی وہ اُداس

اسی کے بیچ میں ہے ایک پیڑ پیپل کا

سُنا ہے میں نے بزرگوں سے یہ کہ عمر اس کی

جو کچھ نہ ہو گی تو ہو گی قریب چھیا نوے سال

چھڑی تھی ہند میں جب پہلی جنگ آزادی
جسے دبانے کے بعد اُس کو غدر کہنے لگے
یہ اہلِ ہند بھی ہوتے ہیں کس قدر معصوم
وہ دار و گیر وہ آزادیٔ وطن کی جنگ
وطن سے تھی کہ غنیمِ وطن سے غدّاری
بپھر گئے تھے ہمارے وطن کے پیر و جواں
دیارِ ہند میں رن پڑ گیا تھا چار طرف
اُسی زمانے میں کہتے ہیں میرے دادا نے
جب ارضِ ہند سینچی خون سے "سپوتوں" کے
میانِ صحن لگایا تھا لا کے اِک پودا
جو آب و آتش و خاک و ہوا سے پلتا ہوا
خود اپنے قد سے بجوشِ نمو نکلتا ہوا
فسونِ روحِ نباتی رگوں میں چلتا ہوا
نگاہِ شوق کے سانچوں میں روز ڈھلتا ہوا

سنا ہے راویوں سے دیدنی تھی اُس کی اٹھان
ہر اک کے دیکھتے ہی دیکھتے چڑھا پروان
وہی ہے آج یہ چھتنار پیڑ پیپل کا
وہ ٹہنیوں کے کمنڈل لئے جٹا دھاری
زمانہ دیکھے ہوئے ہے یہ پیڑ بچپن سے
رہی ہے اس کے لئے داخلی کشش مجھ میں
رہا ہوں دیکھتا چپ چاپ دیر تک اُس کو
میں کھو گیا ہوں کئی بار اس نظارے میں
وہ اس کی گہری جڑیں تھیں کہ زندگی کی جڑیں؟
پسِ سکون شجر کوئی دل دھڑکتا تھا
میں دیکھتا تھا کبھی اس میں زندگی کا اُبھار
میں دیکھتا تھا اسے ہستئِ بشر کی طرح
کبھی اُداس کبھی شادماں، کبھی گمبھیر

فضا کا سرمئی رنگ اور ہو چلا گہرا
گھُلا گھُلا سا فلک ہے دھواں دھواں سی ہے شام
ہے جھٹپٹا کہ کوئی اژدہا ہے مائلِ خواب
سکوتِ شام میں درماندگی کا عالم ہے
رُکی رُکی سی کسی سوچ میں ہے موجِ صبا
رُکی رُکی سی صفیں ملگجی گھٹاؤں کی
اُتار پر ہے سرِ صحن رقص پیپل کا
وہ کچھ نہیں ہے اب اک جنبشِ خفی کے سوا
خود اپنی کیفیت نیلگوں میں ہر لحظہ
یہ شام ڈوبتی جاتی ہے چھپتی جاتی ہے
حجابِ وقت سرے سے ہے بے حس و حرکت
رُکی رُکی دلِ فطرت کی دھڑکنیں یک لخت
یہ رنگِ شام کہ گردش ہی آسماں میں نہیں

بس ایک وقفہ تاریک ، لمحۂ شہلا
سما میں جنبشِ مبہم سی کچھ ہوئی ـــــ فوراً
تُلی گھٹا کے تلے بھیگے بھیگے پتوں سے
ہری ہری کئی چنگاریاں سی پھوٹ پڑیں
کہ جیسے کھلتی جھپکتی ہوں بے شمار آنکھیں
عجب یہ آنکھ مچولی تھی نور و ظلمت کی
سہانی نرم لویں دیتے اَن گنت جگنو
گھنی سیاہ خنک پتیوں کے جھُرمٹ سے
مثال چادرِ شب تاب جگمگانے لگے
کہ تھرتھراتے ہوئے آنسوؤں سے ساغرِ شام
چھلک چھلک پڑے جیسے بغیر سان گمان
بطونِ شام میں ان زندہ قمقموں کی دمک
کسی کی سوئی ہوئی یاد کو جگاتی تھی ـــــ
وہ بے پناہ گھٹا وہ بھری بھری برسات

وہ سین دیکھ کے آنکھیں مری بھر آتی تھیں

مری حیات نے دیکھی ہیں بیس برساتیں
مرے جنم ہی کے دن مر گئی تھی ماں میری
وہ ماں کہ شکل بھی جس ماں کی میں نہ دیکھ سکا
جو آنکھ بھر کے مجھے دیکھ بھی سکی نہ، وہ ماں
میں وہ پسر ہوں جو سمجھا نہیں کہ ماں کیا ہے
مجھے کھلائیوں اور دائیوں نے پالا تھا
وہ مجھ سے کہتی تھیں جب گھر کے آتی تھی برسات
جب آسمان میں ہر سو گھٹائیں چھاتی تھیں
بوقت شام جب اُڑتے تھے ہر طرف جگنو
دیے دکھاتے ہیں یہ بھولی بھٹکی روحوں کو
مزہ بھی آتا تھا مجھ کو کچھ اُن کی باتوں میں
میں ان کی باتوں میں رہ رہ کے کھو بھی جاتا تھا

پر اُس کے ساتھ ہی دل میں کسک سی ہوتی تھی
کبھی کبھی یہ کسک ہوک بن کے اُٹھتی تھی
یتیم دل کو مرے یہ خیال ہوتا تھا!
یہ شام مجھ کو بنا دیتی کاش اک جگنو
تو ماں کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ
کہاں کہاں وہ بچاری بھٹک رہی ہوگی
کہاں کہاں مری خاطر بھٹک رہی ہوگی
یہ سوچ کر مری حالت عجیب ہو جاتی
پلک کی اوٹ میں جگنو چمکنے لگتے تھے
کبھی کبھی تو مری ہچکیاں سی بندھ جاتیں
کہ ماں کے پاس کسی طرح میں پہنچ جاؤں
اور اس کو راہ دکھاتا ہوا میں گھر لاؤں
دکھاؤں اپنے کھلونے دکھاؤں اپنی کتاب
کہوں کہ پڑھ کے سنا تو مری کتاب مجھے

پھر اُس کے بعد دکھاؤں اُسے میں وہ کاپی
کہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنی تھیں کچھ جس میں
یہ حرف تھے جنھیں میں نے لکھا تھا پہلے پہل
دکھاؤں پھر اسے آنگن میں وہ گلاب کی بیل
سُنا ہے جس کو اُسی نے کبھی لگایا تھا
یہ جب کی بات ہے جب میری عمر ہی کیا تھی
نظر سے گزری تھیں کل چار پانچ برساتیں

گزر رہے تھے مہ و سال ——— اور موسم پر
ہمارے شہر میں آتی تھی گھر کے جب برسات
جب آسمان میں اُڑتے تھے ہر طرف جگنو
ہوا کی موجِ رواں پر دیئے جلائے ہوئے
فضا میں رات گئے جب درخت پیپل کا!
ہزاروں جگنوؤں سے کوہ طور بنتا تھا

ہزاروں دادئ ایمن تھیں جس کی شاخوں میں

یہ دیکھ کر مرے دل میں یہ ہوک اٹھتی تھی

کہ میں بھی ہوتا انھیں جگنوؤں میں اک جگنو

تو ماں کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ

وہ ماں میں جس کی محبت کے پھول چُن نہ سکا

وہ ماں میں جس سے محبت کے بول سُن نہ سکا

وہ ماں کہ بھینچ کے جس کو کبھی میں سو نہ سکا

میں جس کے آنچلوں میں منھ چھپا کے رو نہ سکا

وہ ماں کہ گھٹنوں سے جس کے کبھی لپٹ نہ سکا

وہ ماں کہ سینے سے جس کے کبھی چمٹ نہ سکا

ہمک کے گود میں جس کی کبھی میں چڑھ نہ سکا

میں زیرِ سایۂ اُمید جس کے بڑھ نہ سکا

وہ ماں میں جس سے شرارت کی داد پا نہ سکا

میں جس کے ہاتھوں محبت کی مار کھا نہ سکا

سنوارا جس نے نہ میرے جھنڈولے بالوں کو
بسا سکی نہ جو ہونٹوں سے سُونے گالوں کو
جو میری آنکھوں میں آنکھیں کبھی نہ ڈال سکی
نہ اپنے ہاتھوں سے مجھ کو کبھی اُچھال سکی
وہ ماں جو کوئی کہانی مجھے سُنا نہ سکی
مجھے سلانے کو جو لوریاں بھی گا نہ سکی
وہ ماں جو دودھ بھی اپنا مجھے پلا نہ سکی
وہ ماں جو ہاتھ سے اپنے مجھے کھلا نہ سکی
وہ ماں گلے سے مجھے جو کبھی لگا نہ سکی
وہ ماں جو دیکھتے ہی مجھ کو مسکرا نہ سکی
کبھی جو مجھ سے مٹھائی چھپا کے رکھ نہ سکی
کبھی جو مجھ سے دہی بھی بچا کے رکھ نہ سکی
میں جس کے ہاتھ میں کچھ دیکھ کر ڈہک نہ سکا
ٹُمک ٹُمک کے کبھی پاؤں میں ٹھنک نہ سکا

کبھی نہ کھینچا شرارت سے جس کا آنچل بھی
رچا سکی مری آنکھوں میں جو نہ کاجل بھی
وہ ماں جو میرے لیے تتلیاں پکڑ نہ سکی
جو بھاگتے ہوئے بازو مرے جکڑ نہ سکی
بڑھایا پیار کبھی کر کے پیار میں نہ کمی
جو منہ بنا کے کسی دن نہ مجھ سے روٹھ سکی
جو یہ بھی کہہ نہ سکی جا نہ بولوں گی تجھ سے
جو ایک بار خفا بھی نہ ہو سکی مجھ سے
وہ جس کو جوٹھا لگا منہ کبھی دکھا نہ سکا
کثافتوں پہ مری جس کو پیار آ نہ سکا
جو مٹی کھانے پہ مجھ کو کبھی نہ پیٹ سکی
نہ ہاتھ تھام کے مجھ کو کبھی گھسیٹ سکی
وہ ماں جو گفتگو کی رو میں سن کے میری بڑ
کبھی جو پیار سے مجھ کو نہ کہہ سکی گھامڑ

شرارتوں سے مری جو کبھی اُلجھ نہ سکی
حماقتوں کا مری فلسفہ سمجھ نہ سکی
وہ ماں کبھی جسے چونکانے کو میں ٹک نہ سکا
میں راہ چھینکنے کو جس کے آگے رُک نہ سکا
جو اپنے ہاتھ سے بہروپ میرے بھر نہ سکی
جو اپنی انکھوں کو آئینہ میرا کر نہ سکی
گلے میں ڈالی نہ باہوں کی پھول مالا بھی
نہ دل میں لوح جبیں سے کیا اُجالا بھی
وہ ماں کبھی جو مجھے بدھیاں پنہا نہ سکی
کبھی مجھے نئے کپڑوں سے جو سجا نہ سکی
وہ ماں نہ جس سے لڑکپن کے جھوٹ بول سکا
نہ جس کے دل کے دران کنجیوں سے کھول سکا
وہ ماں میں پیسے کبھی جس کے کبھی چرا نہ سکا
سزا کے بچنے کو جھوٹی قسم بھی کھا نہ سکا

وہ ماں کہ آیتِ رحمت ہے جس کی چین جبیں
وہ ماں کہ ہاں سے بھی ہوتی ہے بڑھ کے جس کی نہیں
دمِ عتاب جو بنتی فرشتہ رحمت کا
جو راگ چھیڑتی جھنجھلا کے بھی محبت کا
وہ ماں کہ گھڑکیاں بھی جس کی گیت بن بن جائیں
وہ ماں کہ جھڑکیاں بھی جس کی پھول ہی برسائیں
وہ ماں ہم اس سے جو دم بھر کو دشمنی کر لیں
تو یہ نہ کہہ سکے اب آؤ دوستی کر لیں
کبھی جو سن نہ سکی میری توتلی باتیں
جو دے سکی نہ کبھی تھپڑوں کی سوغاتیں
وہ ماں بہت سے کھلونے جو مجھ کو دے نہ سکی
خراجِ سرخوشیٔ سرمدی جو لے نہ سکی
وہ ماں میں جس سے لڑائی کبھی نہ ٹھان سکا
وہ ماں میں جس پہ کبھی مٹھیاں نہ تان سکا

وہ میری ماں میں کبھی جس کی پیٹھ پر نہ چڑھا

وہ میری ماں کبھی کچھ جس کے کان میں نہ کہا

وہ ماں کبھی جو مجھے کردھنی پنہا نہ سکی

جو تال ہاتھ سے دے کر مجھے نچا نہ سکی

جو میرے ہاتھ سے اک دن دوا بھی پی نہ سکی

کہ مجھ کو زندگی دینے میں جان ہی دے دی

وہ ماں نہ دیکھ سکا زندگی میں جس کی چاہ

اسی کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ

یہ سوچ سوچ کے آنکھیں مری بھر آتی تھیں

تو جا کے سونے بچھونے پہ لیٹ رہتا تھا

کسی سے گھر میں نہ راز اپنے دل کے کہتا تھا

یتیم تھی مری دنیا، یتیم میری حیات

یتیم شام و سحر تھی، یتیم تھے شب و روز

یتیم میری پڑھائی تھی میرے کھیل یتیم
یتیم میری مسرت تھی میرا غم بھی یتیم
یتیم آنسوؤں سے تکیہ بھیگ جاتا تھا
کسی سے گھر میں نہ کہتا تھا اپنے دل کا بھید
ہر اک سے دور اکیلا اُداس رہتا تھا
کسی شمائلِ نادیدہ کو میں تکتا تھا
میں ایک وحشتِ بے نام سے ہڑکتا تھا

گزر رہے تھے مہ و سال اور موسم پر
اسی طرح کئی برساتیں آئیں اور گئیں
میں رفتہ رفتہ پہنچنے لگا بہ سنِّ شعور
تو جگنوؤں کی حقیقت سمجھ میں آنے لگی
اب اِن کھلائیوں اور دائیوں کی باتوں پر
مرا یقیں نہ رہا مجھ پہ ہو گیا ظاہر

کہ بھٹکی روحوں کو جگنو نہیں دکھاتے چراغ

وہ من گھڑت سی کہانی تھی اک فسانہ تھا
وہ بے پڑھی لکھی کچھ عورتوں کی تھی بکواس
بھٹکتی روحوں کو جگنو نہیں دکھاتے چراغ
یہ کھل گیا مرے بہلانے کو تھیں یہ باتیں
مرا یقیں نہ رہا ان فضول قصوں پر ــــ

ہمارے شہر میں آتی ہیں اب بھی برساتیں
ہمارے شہر پہ اب بھی گھٹائیں چھاتی ہیں
ہنوز بھیگی ہوئی سرمئی فضاؤں میں
خطوط نور بناتی ہیں جگنوؤں کی صفیں
فضائے تیرہ میں اڑتی ہوئی یہ قندیلیں
مگر میں جان چکا ہوں اسے بڑا ہو کر
کسی کی روح کو جگنو نہیں دکھاتے راہ

کہا گیا تھا جو بچپن میں مجھ سے جھوٹ تھا سب

مگر کبھی کبھی حسرت سے دل میں کہتا ہوں
یہ جانتے ہوئے جگنو نہیں دکھاتے چراغ
کسی کی بھٹکی ہوئی روح کو ——— مگر پھر بھی
وہ جھوٹ ہی سہی کتنا حسین جھوٹ تھا وہ
جو مجھ سے چھین لیا عمر کے تقاضے نے

میں کیا بتاؤں وہ کتنی حسین دنیا تھی
جو بڑھتی عمر کے ہاتھوں نے چھین لی مجھ سے
سمجھ سکے کوئی اے کاش عہد طفلی کو
جہان دیکھنا مٹی کے ایک ریزے کو
نمود لالۂ خودرو میں دیکھنا جنت
کرے نظارہ کونین اک گھروندے میں

اٹھا کے رکھ لے خدائی کو جو ہتھیلی پر
کرے دوام کو جو قید ایک لمحے میں
سُنا ہے وہ قادرِ مطلق ہے ایک ننھی سی جان
خدا بھی سجدے میں جھک جائے سامنے اُس کے

یہ عقل و فہم بڑی چیز ہیں مجھے تسلیم
مگر لگا نہیں سکتے ہم اس کا اندازہ
کہ آدمی کو یہ پڑتی ہیں کس قدر مہنگی
اک ایک کر کے وہ طفلی کے ہر خیال کی موت
بلوغ سن میں وہ صدمے نئے خیالوں کے
نئے خیال کا دھچکا نئے خیال کی ٹیس
نئے تصوروں کا کرب، الاماں، کہ حیات
تمام زخم نہاں ہے تمام نشتر ہے
یہ چوٹ کھا کے سنبھلنا محال ہوتا ہے

سکوت رات کا جس وقت چھیڑتا ہے ستار
کبھی کبھی تری پائل کی آتی ہے جھنکار
تو میری آنکھوں سے موتی برسنے لگتے ہیں
اندھیری رات کے پرچھاویں ڈسنے لگتے ہیں
میں جگنو بن کے تو تجھ تک پہنچ نہیں سکتا
جو تجھ سے ہو سکے اے ماں تو وہ طریقہ بتا
تو جس کو پا لے وہ کا غذ اچھال دوں کیسے
یہ نظم میں ترے قدموں میں ڈال دوں کیسے

نوائے درد سے کچھ جی تو ہو گیا ہلکا
مگر جب آتی ہے برسات کیا کروں اس کو
جب آسمان میں اڑتے ہیں ہر طرف جگنو
شراب نور لئے سبز آبگینوں میں

کنول جلاتے ہوئے ظلمتوں کے سینوں میں
جب ان کی تابش بے ساختہ سے پیپل کا
درخت سرو چراغاں کو مات کرتا ہے
نہ جانے کس لئے آنکھیں مری بھر آتی ہیں

پرچھائیاں

(۱)

یہ شام کے آئینۂ نیلگوں ، یہ نم ، یہ مہک
یہ منظروں کی جھلک ، کھیت ، باغ ، دریا ، گاؤں
وہ کچھ سلگتے ہوئے ، کچھ سلگنے والے الاؤ
سیاہیوں کا دبے پاؤں آسماں سے نزول
لٹوں کو کھول دے جس طرح شام کی دیوی
پُرانے وقت کے برگد کی یہ اداس جٹائیں
قریب و دور یہ گودھول کی اُبھرتی گھٹائیں

ہ گودھول ۔ چراگاہوں سے پلٹتے ہوئے مویشی کی چالوں سے اُڑتی ہوئی گرد

یہ کائنات کا ٹھہراؤ، یہ اتھاہ سکوت
یہ نیم تیرہ فضا روزِ گرم کا تابوت
دھواں دھواں سی زمیں ہے گھُلا گھُلا سا فلک

(۲)

یہ چاندنی، یہ ہوائیں، یہ شاخِ گُل کی لچک
یہ دورِ بادہ، یہ سازِ خموش فطرت کے
سنائی دینے لگی جگمگاتے سینوں میں
دلوں کے نازک و شفاف آبگینوں میں
ترے خیال کی پڑتی ہوئی کرن کی کھنک

(۳)

یہ رات! چھنتی ہواؤں کی سوندھی سوندھی مہک
یہ کھیت کرتی ہوئی چاندنی کی نرم دمک

سگندھ رات کی رانی[1] کی جب مچلتی ہے
فضا میں روح طرب کروٹیں بدلتی ہے
یہ روپ سر سے قدم تک حسین جیسے گناہ
یہ عارضوں کی دمک، یہ فسونِ چشم سیاہ
یہ دھج نہ دے جو اجنتا کی صنعتوں کو پناہ
یہ سینہ پڑ ہی گئی دیولوک[2] کی بھی نگاہ
یہ سرزمین ہے آکاش کی پرستش گاہ
اُتارتے ہیں تری آرتی ستارہ و ماہ
سجل بدن کی بیاں کس طرح ہو کیفیت
سرسوتی[3] کے بجاتے ہوئے ستار کی گت
جمالِ یار ترے گلستاں کی رہ رہ کے

لہ رات کی رانی یا رات رانی ایک خوشبودار پودے کا نام جس کے پھول رات کو کھلتے اور بہت نرم خوشبو دیتے ہیں۔

لہ دیولوک۔ دیوتاؤں کی دنیا۔ عالم قدس

لہ سرسوتی تلفظ سرس (تی) علوم فنوں کی دیوی

جبینِ ناز تری کہکشاں کی رہ رہ کے
دلوں میں آئینہ در آئینہ سہانی جھلک

(۴)

یہ چھب، یہ روپ، یہ جوبن، یہ سج، یہ دھج، یہ لہک
چمکتے تاروں کی کرنوں کی نرم نرم پھُوار
یہ رسمساتے بدن کا اٹھان اور یہ اُبھار
فضا کے آئینہ میں جیسے لہلہائے بہار
یہ بے قراری یہ بے اختیار جوشِ نمود
کہ جیسے نور کا فوّارہ ہو شفق آلود
یہ جلوے پیکرِ شب تاب کے یہ بزمِ شہود
یہ مستیاں کہ مئے صاف و دُرد سب بے بود
خجل ہو لعل یمن عضو عضو کی وہ ڈلک

(۵)

بس اک ستارۂ شنگرف کی جبیں پہ جھمک
وہ چال جس سے لبالب گلابیاں چھلکیں
سکوں نما خم ابرو یہ ادھ کھُلیں پلکیں
ہر اک نگاہ سے ایمن کی بجلیاں لپکیں
یہ آنکھ جس میں کئی آسماں دکھائی پڑیں
اڑا دیں ہوش وہ کانوں کی سادہ سادہ لویں
گھٹائیں وجد میں آئیں یہ گیسوؤں کی لٹک

(۶)

یہ کیف و رنگ نظارہ یہ بجلیوں کی لپک
کہ جیسے کرشن سے رادھا کی آنکھ اشارے کرے
وہ شوخ اشارے کہ ربّانیت بھی جائے جھپک

جمالِ سر سے قدم تک تمام شعلہ ہے
سکون و جنبش و رم تک تمام شعلہ ہے
مگر وہ شعلہ کہ آنکھوں میں ڈال دے ٹھنڈک

(۷)

یہ رات! نیند میں ڈوبے ہوئے سے ہیں دیپک
فضا میں بجھ گئے اُڑ اُڑ کے جگنوؤں کے شرار
کچھ اور تاروں کی آنکھوں کا بڑھ چلا ہے خمار
فسردہ چھٹکی ہوئی چاندنی کا دھندلا غبار
یہ بھیگی بھیگی، ادا ہٹ، یہ بھیگا بھیگا نور
کہ جیسے چشمۂ ظلمات میں جلے کافور
یہ ڈھلتی رات! ستاروں کے قلب کا یہ گداز
خنک فضا میں ترا شبنمی تبسم ناز
جھلک جمال کی تعبیر خواب آئینہ ساز
جہاں سے جسم کو دیکھیں تمام ناز و نیاز

جہاں نگاہ ٹھہر جائے راز اندر راز
سکوت نیم شبی ، ہلہلے بدن کا نکھار
کہ جیسے نیند کی وادی میں جاگتا ستسار
ہے بزم ماہ کی پرچھائیوں کی بستی ہے
فضا کی اوٹ سے وہ خامشی برستی ہے
کہ بوند بوند سے پیدا ہو گوش و دل میں کھنک

(۸)

کسی خیال میں ہے غرق چاندنی کی چمک
ہوائیں نیند کے کھیتوں سے جیسے آتی ہوں
حیات و موت میں سرگوشیاں سی ہوتی ہیں
کروروں سال کے جاگے ستارے نم دیدہ
سیاہ گیسوؤں کے سانپ نیم خوابیدہ
یہ پچھلی رات ، یہ رگ رگ میں نرم نرم کسک

آدھی رات کو

(۱)

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پرچھائیں
زمیں سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
جدھر نگاہ کریں اک اتھاہ گم شُدگی
اک ایک کر کے فسردہ چراغوں کی پلکیں
جھپک گئیں۔ جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں
جھلک رہا ہے پڑا چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
فلک پہ تاروں کو پہلی جماہیاں آئیں ——

(۲)

تمولیوں کی دوکانیں کہیں کہیں ہیں کھلی
کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی ہیں شاہراہوں پر
سواریوں کے بڑے گھنگھروؤں کی جھنکاریں
کھڑا ہے اوس میں چپ چاپ ہرسنگار کا پیڑ
دُلہن ہو جیسے حیا کی سگندھ سے بوجھل
یہ موج نور یہ بھرپور یہ کھلی ہوئی رات
کہ جیسے کھلتا چلا جائے اک سفید کنول
سپاہ روس ہیں اب کتنی دور برلن سے؟
—جگا رہا ہے کوئی آدھی رات کا جادو—
چھلک رہی ہے خم غیب سے شراب وجود
فضائے نیم شبی نرگس خمار آلود
کنول کی چٹکیوں میں بند ہے ندی کا سہاگ

(۳۱)

یہ رس کا سیج، یہ سکمار یہ شکوئل گات
نین۔ کمل کی جھپک کام روپ کا جادو
یہ رسمسائی پلک کی گھنی گھنی پرچھائیں
فلک پہ بکھرے ہوئے چاند اور ستاروں کی
چمکتی انگلیوں سے چھڑ کے سازِ فطرت کے
ترانے جاگنے والے ہیں۔ تم بھی جاگ اٹھو

(۴۰)

شعاعِ مہر نے یوں ان کو چوم لیا
ندی کے بیچ کمُدنی کے پھول کھل اُٹھے
نہ مفلسی ہو تو کتنی حسین ہے دُنیا
یہ جھائیں جھائیں سی رہ رہ کے ایک جھینگر کی

حنا کی ٹیٹوں میں نرم سرسراہٹ سی
فضا کے سینے میں خاموش سنساہٹ سی
لٹوں میں رات کی دیوی کی تھرتھراہٹ سی
یہ کائنات اب اک نیند لے چکی ہوگی

(۵)

یہ محوِ خواب ہیں رنگین مچھلیاں تہِ آب
کہ حوض صحن میں اب ان کی چشمکیں بھی نہیں
یہ سرنگوں ہیں سرِ شاخ پھول گڑ ہل کے
کہ جیسے بے بجھے انگارے ٹھنڈے پڑ جائیں
یہ چاندنی ہے کہ اُمڈا ہوا ہے رس ساگر
اک آدمی ہے کہ اتنا دکھی ہے دنیا میں

(۶)

قریب چاند کے منڈلا رہی ہے اک چڑیا
بھنور میں نور کے کروٹ سے جیسے ناؤ چلے
کہ جیسے سینۂ شاعر میں کوئی خواب پلے
وہ خواب سانچے میں جس کے نئی حیات ڈھلے
وہ خواب جس سے پرانا نظام غم بدلے
کہاں سے آتی ہے مدمالتی لتا کی لپٹ
کہ جیسے سیکڑوں پریاں گلابیاں چھڑکائیں
کہ جیسے سیکڑوں بن دیویوں نے جھولے پر
ادائے خاص سے اک ساتھ بال کھول دئیے
لگے ہیں کان ستاروں کے جس کی آہٹ پر
اس انقلاب کی کوئی خبر نہیں آتی
دل نجوم دھڑکتے ہیں کان بجتے ہیں

(۷)

یہ سانس لیتی ہوئی کائنات، یہ شبِ ماہ

یہ پُرسکوں یہ پُراسرار یہ اُداس سماں

یہ نرم نرم ہواؤں کے نیلگوں جھونکے

فضا کی اوٹ میں مُردوں کی گنگناہٹ ہے

یہ رات موت کی بے رنگ مسکراہٹ ہے

دھواں دھواں سے مناظر تمام نم دیدہ

خنک دھندلکے کی آنکھیں بھی نیم خوابیدہ

ستارے ہیں کہ جہاں پر ہے آنسوؤں کا کفن

حیات پردۂ شب میں بدلتی ہے پہلو

کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو

زمانہ کتنا لڑائی کو رہ گیا ہوگا!

مرے خیال میں اب ایک بج رہا ہوگا!

(۸)

گلوں نے چادرِ شبنم نے منھ لپیٹ لیا
لبوں پہ سو گئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی
ذرا بھی سنبلِ تر کی لٹیں نہیں ہلتیں
سکوتِ نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں

اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں
گزر رہے ہیں کئی کارواں دھندلکے میں
سکوت نیم شبی ہے انھیں کے پاؤں کی چاپ
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو

(۹)

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا
نئے ستارے، نئی گردشیں، نئے دن رات

زمیں سے تا بہ فلک انتظار کا عالم

فضائے زرد میں، دھندلے غبار کا عالم

حیات موت نما انتشار کا عالم

ہے موجِ دود کہ دھندلی فضا کی نبضیں ہیں

تمام خستگی و ماندگی یہ دورِ حیات

تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی یہ رات

یہ سرد سرد یہ بیجان پھیکی پھیکی چمک

نظامِ ثانیہ کی موت کا پسینا ہے [۱]

خود اپنے آپ میں یہ کائنات ڈوب گئی

خود اپنے کوکھ سے پھر جگمگا کے ابھرے گی

بدل کے کیچلی جس طرح ناگ لہرائے

---

[۱] پہلا نظام جاگیرداری، دوسرا نظام سرمایہ داری تیسرا نظام اشتراکیت (فراق)

(۱۰)

خنک فضاؤں میں رقصاں ہیں چاند کی کرنیں
کہ آبگینوں پہ پڑتی ہے نرم نرم پھوار
یہ موجِ غفلتِ معصوم یہ خمار بدن
یہ سانس نیند میں ڈوبی یہ آنکھ مدماتی
اب آؤ میرے کلیجے سے لگ کے سو جاؤ
یہ پلکیں بند کرو اور مجھ میں کھو جاؤ

لسان العصر اکبر الہ آبادی

اکبر کی شاعری آدھی صدی تک دیس بھر میں گونجتی رہی ہے۔ اُن
کے بہت سے نظریے اور عقاید ایسے تھے جن سے اختلاف ممکن ہے
کئی لحاظ سے اکبرؔ کو قدامت پرست اور رجعت پرست بھی لوگوں نے
کہا ہو. لیکن اس سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وطن پرستی اُن میں
کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ وہ رواداری. تہذیبی پنچ شیل اور
متحدہ قومیت کے علمبردار تھے ______________ (فراق)

تِرے کلام میں تھی گدگدی کبھی آنسو بھی　　کبھی وطن کو ہنسایا کبھی اداس کیا
سخن کے ساز میں وہ درد بھر دیا تو نے　　وطن کو اپنے ترانوں سے خودشناس کیا

چراغِ راہ نہ کوئی نہ کوئی بانگ جرس ہمیں خبر ہی نہ تھی ہم کہاں تھے اے اکبرؔ
نچا رہا تھا کوئی چلتے پھرتے مردوں کو ہم آدمی نہ تھے کٹھ پتلیاں تھے اے اکبرؔ

ہزاروں عالم دیں تھے بہت سے مصلح قوم خدا کے بندوں کے تھے سب دکھاوے کے چھل بل
نہ اُنکی چرب زبانی نہ چٹکیاں تیری ترے مذاق نے ہم کو دیا پیامِ عمل

کچھ ایسا وقت پڑا تھا کہ چند اکابرِ ہند وطن کو بیچ دیں حبِ وطن کے پردے میں
ترا ہی کام تھا افشار، راز کر دینا دلوں کا چور نکالا سخن کے پردے میں

ادھر تھے وعدہ و پیماں وفا کی سوگندیں اِدھر بھی خیر سے حاکم کا فیض تھا جاری
اچانک ایسے میں دو ٹوک بات تو نے کہی خطاب و جاہ و مراتب نثارِ خود داری

ہزاروں انجمن آرائیوں کی ہلچل میں ہنوز کانوں میں گونجی ہوئی ہے تیری پکار
کہ جلسوں اور ڈیپوٹیشنوں کے دھوکے نہ کھاؤ یہ طمطراق ہے بیداریٔ غلط، ہشیار!

وہ اینڈ اینڈ کے چلنا وہ پاؤں میں زنجیر — نثارِ قوم کے انداز خوش خرامی کے
مگر یہ کہہ کے سرِ راہ تو نے ٹوک دیا — نہ کھا فریب ترقی نما غلامی کے

کہا کہ لاٹ کے دربار میں ملی کرسی — کہا کہ دوستو اس نقلی شد و مد سے بچو
کہا کہ ان کی اعانت سے قوم پنپے گی — کہا کہ بھائیو انگریز کی مدد سے بچو

بہت سے کھونٹے کے بل پر اُچھلتے تھے بچھڑے — کہے یہ کون مآل اس کا نامرادی ہے
رہا نہ تجھ سے گیا اور تو پکار اُٹھا — جہاں میں رازِ ترقی خود اعتمادی ہے

خیال تھا کہ مسلمانوں کی مصیبت کو — وطن کی عام مصیبت سے کر سکیں گے الگ
گمان تھا کہ مسلمان اس زمانے میں — ہر اک سے توڑ کے رشتہ اُبھر سکیں گے الگ

ہر اک کو عظمتِ پارینہ یاد آنے لگی — گزشتہ صدیوں کی باسی کڑھی میں آیا اُبال
دیارِ ہند بنا محضرِ رجز خوانی — پڑی وہ پھوٹ لگی جوتیوں میں بٹنے دال

زمیں چیخ اٹھی آسمان کانپ اٹھا — فضا میں نعرے تھے یا زلزلوں کی آہٹ تھی
ان اندھے دعووں کے اس زور و زعم کے سب کے — جواب میں تری خاموش مسکراہٹ تھی

یہ تیری رقت جذبات کا کرشمہ تھا — وطن کا درد نظر میں رہا نمی ہو کر
پر اس کے ساتھ ہی کیا تیرا ظرف تھا اکبر — جگر کی چوٹ لبوں پر رہی ہنسی ہو کر

عجیب لوگ تھے ہندو ہوں یا مسلماں ہوں — کہ بات بات میں بھائی سے لیتے تھے ٹکر
ترے سوال پہ ہر اک طرف تھا سناٹا — ہمارے دیس میں ہیں آدمی کہ گھن چکر

ہر اک حریف چمن سے یہ قول تھا تیرا — الجھ کے کانٹوں سے تم بوستاں بھلا دو گے
سبق پڑھو گے اگر ہندو مسلماں کا — تو یاد رکھو گے ہندوستاں بھلا دو گے

لٹے چمن میں بھی وہ راگ رنگ کا عالم — تھے عندلیب کے نغمے صدا رتوتی تھی
تھے رنگ رنگ ترانے مگر تری آواز — حیات ہند کی دکھتی رگوں کو چھوتی تھی

اک آدھ ایسے بھی گزرے ہیں شاعرِ ملت   وہ ان کی شعلہ نوائی وہ طنطنہ وہ اُبھار
دلِ وجود کو جن کی نگاہ چیر گئی   مگر جو ہند کی وحدت سے ہو سکے نہ دوچار

صدائے از ہر گداز ان کی واہ وا لیکن   زمینِ پاک کی اشعار میں نہیں بو باس
علوِ فکر میں اُن کے نہیں کلام مگر   ذرا بھی ہند کی توہین کا نہیں احساس

یہ سوچتے تھے عجب کیا کہ قوم پستی سے   لگا کے جست کوئی کہکشاں سے جا ٹکے
یہ رنگ دیکھ کے تو بول اٹھا کہ قوم کہیں   نہ آسمان سے گر کر کجھور میں اٹکے

جہاں فرازِ مہ و مشتری کا ذکر نہیں   ترے خیال میں وہ رفعتیں تھیں اے اکبر
جہاں حجاز و عجم میں نہیں حدِ فاصل   تری نگاہ میں وہ وسعتیں تھیں اے اکبر

تری نوا سے حکومت کو خوف تھا نہ کہیں..   دلوں میں آگ لگا دے یہ شعلۂ عنبی
ہوا نہ وقت کے دامن نے کھل کے دی اسکو   کہ انقلاب کی چنگاریاں تھیں اُس میں دبی

میں سوچتا ہوں کہاں نعرۂ بپاسی میں
جو تازیانۂ ہمت تری للکار میں ہے

کہاں وہ سخت کلامیِ شیخ و واعظ میں
جو تیز نشتریت تیری چھیڑ چھاڑ میں ہے

کوئی بتائے کہاں فلسفہ کے نکتوں میں
جو ایک راز تری شوخیِ نگاہ میں ہے

میں پوچھتا ہوں کہاں منطق ارسطو میں
جو ایک بات تری طنزِ بے پناہ میں ہے

تری شگفتہ نوائی کی وہ بہارِ سخن...
کہ مصرعے مصرعے میں کھلتا ہوا گلستاں تھا

کچھ آنکھ والے ہی اس کو پرکھ سکے لیکن
پسِ مزاح جو اشکوں کا شبنمستاں تھا

ہماری نیند نے مردوں سی شرط باندھی تھی
حیاتِ ہند کے ماتھے پہ موت کا تھا کلنک

وہ تیز ٹیس اٹھی آنکھ کھل گئی جو لگا
ترے تبسمِ زیرلبی کا تیکھا ڈنک

بہت سے خطبۂ سنجیدہ ہم نے دیکھے ہیں
ہزار فکر و نظر تیرے قہقہوں پہ نثار

چمن میں منہ بندھی کلیوں نے خون تھوک دیا
جو گلستاں پہ پڑی تیرے چہچوں کی سنوار

الٹ گیا ہوں ہزاروں کتابوں کے اوراق وہ ان کی سحر نگاری وہ ان کا حسن بیان
مگر کہیں نہ ملا تیرا سوز و ساز وطن چمک اٹھا ہی تری لے میں درد ہندوستان

نئی زمین نیا آسماں، نئی دنیا نئی ہے محفل ساقی نئے ہیں جام و سبو
یہ سب سہی مگر اے جرعہ نوش بادۂ ہند ہنسا رلا کے ہمیں دے گیا بہت کچھ تو

داستانِ آدم

قرنوں کے مٹانے سے مٹے ہیں نہ مٹیں گے
آفاتِ زمانہ سے جھکے ہیں نہ جھکیں گے
اُبھرے تو دبانے سے دبے ہیں نہ دبیں گے
ہم موت کے مارے بھی مرے ہیں نہ مریں گے

ہم زندہ تھے، ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

گو بحر و بر و چرخ مٹانے پہ تُلے ہیں
اُبھرے ہوئے کہسار کے تیور بھی کڑے ہیں
بے درد عناصر بھی بہت بپھرے ہوئے ہیں

بن بن کے مٹے جائیں گے مٹ مٹ کے بنیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

تاریخ و تمدن سے بہت پہلے کے ادوار

بے تیغ و سپر موت سے وہ جنگ وہ پیکار

وہ غولِ بیاباں وہ بہائم کئی خونخوار

ایسے میں جیے ہیں تو کبھی ہم نہ مریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

وہ شامِ بیاباں وہ سیہ خانۂ دوراں

ہم ششدر و حیران و پریشان و ہراساں

اک دل تھا لرزتا سا چراغِ تہ داماں

کیونکر ہم اسیرانِ ستم صبح کریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جو شاخ لچکتی ہے کڑکتی سی کماں ہے

جو چیز چمک جاتی ہے اک نوکِ سناں ہے

ایک ایک کرن تاروں کی ناگن کی زبان ہے
ہر لحظہ یہی خوف کہ اب کے نہ بچیں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

انسان ہے اور چار طرف وادئ پر خار
پُر ہول مناظر کا وہ ماحول شرر بار
وہ بولتے سناٹے وہ زندانِ شبِ تار
کمزور ہیں پر جبرِ مشیّت سے لڑیں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

اِک اجنبی سنسار کے یہ کوہ و بیاباں
دریائے شبِ تار کے اٹھتے ہوئے طوفاں
وہ اڑتے ہوئے اژدھے وہ شام غریباں
ظلمت کدۂ غیر کو مانوس کریں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

فیلوں کی وہ چنگھاڑ وہ شیروں کی دہاڑیں

پڑتی تھیں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دراڑیں
روتی تھی شبِ تار کہیں مار کے دھاڑیں
انسان تو کیا ہوش فرشتوں کے اڑیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جھکّڑ وہ ہوا کے وہ فضاؤں کی ڈکاریں
صحرائے شب اور کانپتے سایوں کی قطاریں
سہمے ہوئے انساں کی وہ چیخیں وہ پکاریں
افلاک جب انسان کے قدموں پہ جھکیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

وہ گھور اندھیرا جو زمانے کو نگل جائے
وہ رات بھیانک دل ارجن بھی دہل جائے
وہ شور کہ محور سے زمیں چیخ کے ٹل جائے
جل تھل چل اچل دشت و جبل کانپ اٹھیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

کچھ پوچھو نہ فطرت کا جو برتاؤ تھا ہم سے
ہر لمحہ پھٹے پڑتے تھے سو کوہ الم سے
دل کی نہ بجھی شمع کبھی دامنِ غم سے
ہستی کے نشاط اپنی مرادوں سے پلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

روشن تھا اسی شمع سے راتوں کا اندھیرا
جاگ اٹھتے تھے جب غاروں میں ہنستا تھا سویرا
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را
قدرت کے ہر اک جور پہ ہم خوب ہنسیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

اے روحِ زمیں روح زماں روح مکاں خیز
اے جان جہاں جانِ جہاں جانِ جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
ہم شاہد تاریخ کو بیدار کریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جب دشت نوردی کے منازل سے بڑھ آئے
گرِ خانہ بدوشی کو زراعت کے سکھائے
پُرامن سکونت کے لئے گاؤں بسائے
کل اپنے ہی قدموں کے تلے شہر اُگیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

کھیتوں کو سنوارا تو سنورتے گئے خود بھی
فصلوں کو اُبھارا تو اُبھرتے گئے خود بھی
فطرت کو نکھارا تو نکھرتے گئے خود بھی
نت اپنے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

بے فیضئ فطرت کا نہ رونا ہے نہ دھونا
مٹی کی زمیں بھی تو اُگلنے لگی سونا
سوئی ہوئی دھرتی کو ہے کچھ اور ہی ہونا
منزل کو جگا دیں گے جہاں پاؤں دھریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

ان وادیوں کو جن میں نہیں بارشِ رحمت
ان گھاٹیوں کو جن میں اڑے گرد کدورت
ان کھاڑیوں کو جن میں نہیں بوئے لطافت
ہم اہل زمیں رو کشِ فردوس کریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

اب وقت کے سینے میں چٹکنے لگیں کلیاں
اب رنگ پر آئے ہیں فضاؤں کے گلستاں
شبنم کی کھنک، گُل کی دمک صوتِ ہزاراں

ہم خود ہی گل و بلبل و صیّاد بنیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

القصّہ زمانے کو پڑی اس کی ضرورت

بٹ جائے کئی طبقوں میں انسان کی ملت

تہذیب بڑھے اس لئے وہ جن کی ہے کثرت

گردن پہ جوا بارِ غلامی کا دھریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

طبقوں کا وہ ٹکراؤ، مفادوں کا وہ تصادم

وہ شاہد تاریخ کے سینے کا تلاطم

آنکھوں میں وہ کچھ اشک وہ ہونٹوں پہ تبسّم

تفریق و تفاوت سے بہت کام بنیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

تہذیب کو پروان چڑھایا ہے ہمیں نے

تاریخ کو ہر درس پڑھایا ہے ہمیں نے

سیّاروں کی گردش کو بڑھایا ہے ہمیں نے
اب شمس و قمر اپنے اشاروں پہ چلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

ویران کو ذی شان بنایا ہے ہمیں نے
دھرتی کو پرستان بنایا ہے ہمیں نے
انسان کو انسان بنایا ہے ہمیں نے
"کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے"

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

سو رنگ سے دنیا کو ہم آباد کریں گے
ہر گام پہ دنیا نئی ایجاد کریں گے
ہم اس کو سہاگن کی طرح شاد کریں گے
دھرتی کی ہمیں اجڑی ہوئی مانگ بھریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

سانچی کے وہ فن کار اجنتا کے قلم کار

وہ تاج محل حسن کا وہ جادو بیدار

عہد قطب الدیں کا فلک بوس وہ مینار

دنیا کو اک آئینہ تہذیب کریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

اجداد ہمارے تھے سدھارے جو عدم کو

ہیں اب بھی بنائے ہوئے ماضی کے بھرم کو

افریقہ میں ایران میں یا چین میں ہم کو

ڈھونڈو گے تو اجڑے ہوئے کھنڈروں میں ملیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جب مصر کی تہذیب پہ منڈلائے گی ظلمت

ساتھ اپنے چلی جائے گی اہرام کی حرمت

ہم ابن براہیم بصد کلفت و حسرت

جب نیل کی وادی کی زمیں چھوڑ چلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

دنیا میں ہیں کنگال بھی اور اہل دوَل بھی
ہے تاک میں دونوں ہی کے صیاد اجل بھی
دنیا کا ہے یہ رنگ تو کیا راج محل بھی
راتوں کو کپل وستُ سے منھ موڑ چلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

یونان کی مٹتی ہوئی عظمت کا زمانہ
کچھ روزوں میں ہو جائے گا اک خواب فسانہ
جب موت کا وہ ڈھونڈھ رہی ہو گی بہانہ
ایتھنس کے زندان میں ہم زہر پئیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جب روم کی تہذیب زمانے میں تپے گی
جب سینۂ جمہور میں اک آگ لگے گی
جب دیکھیں گے اس آگ سے دنیا نہ بچے گی
کوہوں سے پکاریں گے صلیبوں پہ چڑھیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

پلٹیں گے عرب میں بھی تمدّن کے قرینے
سُن کر نئی آواز دھڑکتے ہوئے سینے
تاب اس کی نہ لائیں گے تو مکّے سے مدینے
اک مصلحتِ غیب سے ہجرت بھی کریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

آندھی کی طرح اٹھیں گے ساسانی و تاتار
تو گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑا دیں گے وہ کہسار
لگ جائیں گے ہر چار طرف لاشوں کے انبار
سو رنگ سے ہم قاتل و مقتول بنیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جاگیر کے یہ دور تھے گہوارۂ تہذیب
ساونتی زمانے کے وہ آئین و اسالیب
حکمت حکمار کی علمار کی بھی وہ تادیب

یہ باب اہم زینت تاریخ بنیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

ادوار غلامی تھے یہ کس شان کے اے دوست

سو طرح سے مٹتے رہے بنتے رہے اے دوست

سامنت بھی کمزور سے اب پڑ چلے اے دوست

سرمایہ کے دنیا میں علمدار بڑھیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

نکلا جو یہ بیڑا تو ممالک، بر اعظم

آتے گئے سب زد میں مچا ہر طرف اُودھم

یہ صاحب سرمایہ ہیں وہ فاتحِ عالم

آزادیٔ اقوام کی سیتا جو ہریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

اب چین، عرب، ہند، حبش، خطۂ ایراں

تپتے ہوئے افریقہ کے وہ شہر و بیاباں

جولانگہ سرمایہ بنیں گے ـــــ یہ رجز خواں

سالاریٔ اقوام کا دعویٰ بھی کریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

فتنے یہ جگا دیں گے جہاں پاؤں دھریں گے

یہ سبز قدم باغ جہاں روند چلیں گے

آئے تو یہ جانے کا کبھی نام لیں گے

یہ مان نہ مان آپ کے مہمان بنیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

لیکن ادب و علم نئی کروٹیں لیں گے

اب زیرنگیں بحر و بر و چرخ کریں گے

فطرت کے اب اسرار پر اسرار کھلیں گے
قدرت پہ فتوحات بشر اور بڑھیں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

ساونتی زمانے سے ہے بڑھ کر یہ زمانہ
کھلتا ہے نہاں خانۂ فطرت کا خزانہ
اب گیسوئے دوراں نہیں منت کش شانہ
ماضی کی نگاہوں کو یہ دن خیرہ کریں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

سائنس کے یہ معجزے ایجادوں کے یہ دور
دنیا کے سب آئین تمدن کے سبھی طور
بدلیں گے ابھی اور ابھی اور ابھی اور
تاریخ کی رفتار بہت تیز کریں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

پہیوں کی وہ لاکھوں مشینوں کا وہ چلنا

وہ انجنوں کا بیچ کے انگارے اُگلنا
وہ بھٹیوں سے آگ کے فوارے اُچھلنا
دہلے گی زمیں کنگرۂ چرخ ہلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

سرمایہ پرستوں کے سراب اونچے اٹھیں گے
اب ان کی سلامی کو مہ و مہر جھکیں گے
یہ نشۂ دولت میں سدا چور رہیں گے
ان صاحبوں کے پاؤں زمیں پر نہ پڑیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

کر دیں گے ہم ایک ان کے لئے خون پسینا
ہم کام کئے جائیں گے مارے ہوئے پتا
آثار بتاتے ہیں پلٹنے کو ہے پاسا
گھورے کے بھی دن کہتے ہیں اک روز پھریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

کل پرزوں کی رفتار میں ہے برق کی سرعت
اب دیکھتے ہی دیکھتے آئے گی یہ نوبت
سامان کی افراط خریدار کی قلت
بازار نئے ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

بازاروں کی خاطر وہ بڑی جنگ چھڑے گی
دنیا کے کئی حصّوں میں اک آگ لگے گی
اس جنگ میں مزدوروں کی تقدیر کھلے گی
سرمایہ پرست اک نئی آفت میں پڑیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جب سست سا پڑ جائے گا توپوں کا دھاکا
ساحل کے قریں آئے گا جب جنگ کا بیڑا
لینین کے ہاتھوں سے پلٹ جائے گی کایا
اب نام و نشاں زار کے مٹی میں ملیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

ہم اب اُفقِ روس سے ہوتے ہیں نمایاں
دنیا کے لئے ہے یہ نئی صبح بہاراں
اب اک نئی تہذیب ہے جلوہ دہِ دوراں
تاریخ و تمدن کے نئے باب کھلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

انسان کی وحدت کبھی طبقوں میں بٹی تھی
تا دیر یہ تقسیم رہی شرط ترقی
سائنس نے اب اس کی ضرورت ہی مٹا دی
اس دور میں سب چھوٹے بڑے ایک بنیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جب رُوس کے مطلع سے ہوا نور کا تڑکا
سرمایہ پرستی کا چراغ اور بھی بھڑکا
ہٹلر کا گرجنا ہے کہ بجلی کا ہے کڑکا
سُن کر بر اعظم بھی جسے کانپ اُٹھیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

وہ جنگ پھر اس دَور میں ہو جائے گی برپا
تاریخِ بشر یاد نہ آ جائے تو کہنا
ایّام جوانی میں تجھے دُودھ چھٹی کا
یہ کہتے ہوئے آگ میں ہم کود پڑیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

افلاک کی تدبیر اُنھیں مار چکی ہے
دیوار کی تحریر اُنھیں مار چکی ہے

THE WRITING ON THE WALL انجیل مقدس کے فقرے کا ترجمہ ہے۔ فراقؔ

جمہور کی تقدیر انھیں مار چکی ہے
اب امن ہو یا جنگ یہ جیتے نہ بچیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

اب ظلم کے ایوان کی بُنیاد ہلے گی
اس زلزلے میں اینٹ سے یوں اینٹ بجے گی
کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے گی
گھہراتے ہوئے کنگرے اس گھر کے گریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

ہم وارثِ مستقبل و تقدیر زماں ہیں
ہم منزلِ مقصودِ جہانِ گزراں ہیں
ہم اپنی کہانی بحدیثِ دگراں ہیں
کچھ کرکے دکھا جائیں گے کیا یاد کریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

رن جیت کے چھوڑیں گے یہ پیمان ہے اپنا

اس عصر کا ہمزاد نگہبان ہے اپنا
تسخیر قضا و قدر ایمان ہے اپنا
ہم ہیں وہ مجاہد کہ مشیّت سے لڑیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

لو جنگ دوئم ختم ہوئی، اب وہ زمانا
آتا ہے جسے اپنے ہی ہاتھوں ہے بنانا
اس جنگ کے وہ تلخ سبق بھول نہ جانا
بھولیں گے اگر ان کو تو جوکھوں میں پڑیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

وہ ہند کی تہذیب و تمدّن کے زمانے
افسانہ در افسانہ ہیں یارو یہ فسانے
سلطانیٔ جمہور کے گا گا کے ترانے
پھر ہند کے قالب میں نئی روح بھریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

ہم عصر کو ہیں تیرے پیام اے نئی دُنیا
روشن ہوئے تیرے در و بام اے نئی دُنیا
یہ سرخ سویرا ہے سلام اے نئی دُنیا
جب دیکھیں گے تجھ کو تو ہمیں یاد کریں گے۔

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

دھرتی کی کروٹ

سورج چاند انگڑائی لیں گے
تارے اپنی گت بدلیں گے
پربت، ساگر لہرائیں گے
جب یہ دھرتی کروٹ لے اگی

پرجا ہی ہے دیش کا راجہ
گھر کی چٹائی راج سنگھاسن
سب کی ٹوپی راج مکٹ ہے
پھوس کا گھر بھی راج محل ہے

ہل، کدال، پھاوڑے، بسولے
اٹھے ہتھوڑے بول اٹھیں گے
نیا جنم ہے آزادی کا
دیش کے راجہ دیش نواسی

جنم جنم کا پاپ کٹے گا
اب تک کس کا راج رہا ہے؟
راجے، بابو، سیٹھ، مہاجن
زمیندار، دیوان، داروغہ

پنڈت، ٹھاکر، شیخ اور سیّد
صاحب، مسٹر، حاکم، افسر
سونا والے، چاندی والے
آڑھت والے، منڈی والے گھِسّے والے، ٹھسّے والے
پٹّے والے، سٹّے والے
کوٹ محل اور کوٹھی والے ان کے چٹّے بٹّے والے
گدی والے، کرسی والے اب تک ان کا راج رہا ہے
مسند والے، فرشی والے
پرمٹ والے لائسنس والے دیش پہ اتیاچار رہا ہے
اب یہ دھرتی کروٹ لے گی
اب یہ دنیا پلٹا لے گی
بھارت کی کایا پلٹے گی

سب کی قسمت چمک جائے گی
کاریگر، مزدور، کسان
بھارت کے بے چین جوان
دبے دبے بے نام و نشان

راج پاٹ کے مالک ہوں گے
راج کے کرتا دھرتا ہوں گے

ابھریں گے بے شان و گمان
مان نہ مان ترا مہمان
ہم کو جان ہمیں پہچان
یہی سنبھالیں گے سب کام

ست جگ سے بھی بڑھ کر ہو گا
رام راج سے بڑھ کر ہو گا

ہر اک جگ سے بڑھ کر ہو گا
براہمن راج سے بڑھ کر ہو گا
چھتّری راج سے بڑھ کر ہو گا
دیشیہ راج سے بڑھ کر ہو گا

ہندو راج سے بڑھ کر ہوگا
بودھ راج سے بڑھ کر ہوگا
مسلم راج سے بڑھ کر ہوگا
محنت کرنے والوں کا راج

کھیتی کرنے والوں کا راج
مال بنانے والوں کا راج
دھن اُپجانے والوں کا راج
ہُن برسانے والوں کا راج

اِس اُوسر بنجر دھرتی کو
اِس جلتی تپتی پرتی کو
سورگ بنانے والوں کا راج

کسانوں کی پکار

نئے نیم سے نئے روپ سے
نئے رنگ سے نئے ڈھنگ سے
کھیتی ہوگی
کھیت اور کھلیان کا رونا

بیج، کھاد، پانی کا رونا
گائے کی ہائے، بیل کا رونا
گھاس کھلی بھوسے کا رونا
زمیندار کی مار کا رونا

گالی اور پھٹکار کا رونا
دھر، پکڑ اور بیگار کا رونا
قرضے اور بیاج کا رونا
بنیئے اور بزاز کا رونا

عزت اور لاج کا رونا
پٹواری کی چال کا رونا

ڈنڈ راج پڑتال کا رونا
ساکھی لال پال کا رونا

آئے دن کے کال کا رونا
ہر چیز اور ہر بات کا رونا
جگ جگ سے دن رات کا رونا
نہیں رہے گا، نہیں رہے گا

دن بدلے گا، پاپ کٹے گا
ساتھی سب سنتاپ کٹے گا
اُن کھلیان سے گھر میں آئے
اِس کی نوبت کب آتی تھی
اُوپر اُوپر اُڑ جاتی تھی
رہ جاتے بھوکے کے بھوکے
رہ جاتے ننگے کے ننگے
رہ جاتے قرضے میں ڈوبے

اب تک چھاتی پھاڑ پرشرم
کرکے جو کچھ فصل اُگائی
وہ گاڑھی بھرپور کمائی
دو دن اپنے کام نہ آئی

جیون کتنا بیاج چکاتے
لیکن اب کچھ ہونے کو ہے
کھیتی، باڑی، باغ اور جنگل
دودھ، دہی، گھی، ناج اور پھل

گاؤں میں جو دولت اُپجے گی
وہ سب کی سب اپنی ہو گی
اب یہ ڈُر بیوہار مٹے گا
اب یہ اتیّا چار مٹے گا

لٹس، پٹس کی ہلچل میں
دھنّا سیٹھ کے چھل، بل، کل میں

چالاکی میں دھونس دھانس میں
دلالوں کی پھوڑ پھانس میں
پھسلانے میں بہکانے میں
ڈروانے میں دھمکانے میں

چتر کسان نہیں آئے گا
وہ اپنا حصّہ، اپنا حق

لے کے رہے گا لے کے رہے گا
جی کے رہے گا مر کے رہے گا
لیکن اب کچھ کر کے رہے گا

ہر بیگھہ میں ہر ایکڑ میں
پیداوار آٹھ گنی ہو گی
بھوک مٹے گی اور گھر گھر میں
اَن پورنا پاس کرے گی

شکشا میں گول مال

ذات پات کا بھید مٹے گا
اونچ نیچ کا بھید مٹے گا
ہندو مسلم بھید مٹے گا
براہمن سودر برابر ہوں گے

عورت مرد برابر ہوں گے
چھوٹے بڑے برابر ہوں گے
بل، ودیا، دھن مان، اور پد
عہدہ، کرسی، عزت، شہرت

جان، مال، دھن اور حکومت
بڑی بڑی جاگیر ریاست
پڑھنا لکھنا، سند لیاقت
بیٹھک بازوں کی تھی دولت

۱

پا کر قسمت کے پتوں کے
چوڑے، پنجے، ستے، اَٹھے
گیا خوش تھے اُلو کے پٹھے

لگے ہیں جب دھکے پر دھکے
چھٹے تڑی بازوں کے چھکے
سب جگہیں یوں لے بیٹھے تھے
سب کچھ یوں ہتھیا بیٹھے تھے
یوں دنیا پر چھائے ہوئے تھے

جیسے ان کی ہو یہ بپوتی
اب دیتا ہے سمے چنوتی
کاریگر مزدور کسان
ان کی بدنصیب سنتان

پڑھنے لکھنے کا حق اِن سے
چھل بل کل سے چھین لیا تھا
اک دھوکا پھیلا رکھا تھا
نیچی، ذات پات والوں کے
بچوں کو نشیہ کب جانا

پڑھنے لکھنے کی اُمنگ کو
نرادھیکار چیشٹا مانا
اِن کے اتنی عقل نہیں ہے
اِن کے پاس دماغ نہیں ہے

انھیں اندھیرے ہی میں رکھو
رین بسیرے ہی میں رکھو

سوجھ نہیں ہے بوجھ نہیں ہے
ماں کی کوکھ سے یہ جنمے ہیں
جنم لنڈورے جنم گنوار

کبھی نہ اُبھرے ان کی ذات
کبھی نہ چمکے ان کی بات
کبھی نہ دن ہو اِن کی رات

چکر چتر دنیا میں اِن کو
اندھا، بہرا گونگا رکھو
گھامڑ اَن پڑھ ڈگّا رکھو
میلا اور کچیلا رکھو

پیڑا رکھو نیچا رکھو
اِن کو چونگا پونگا رکھو
قلم نہ اِن کے ہاتھ میں آئے
پھر تلوار بھی چھن جائے گی

راج کی لنگر دار ناؤ کی
پھر پتوار بھی چھن جائے گی
اپنا بھرم بنائے رکھو
جنتا کو بھرمائے رکھو

اب تک یہ سازش تھی لیکن
اب یہ جادو ٹوٹ چکا ہے
اب یہ بھانڈا پھوٹ چکا ہے

پورا ڈھونگ رچا رکھا تھا
کیا اندھیر مچا رکھا تھا
ودیا کو دفنا رکھا تھا
اس کا روپ چھپا رکھا تھا
دن کو رات بنا رکھا تھا

شبدوں کا آڈمبر رچ کر
من گڑھنت سے ایک بات کا
سو بستار بنا رکھا تھا
اک بیوپار جما رکھا تھا
کاروبار چلا رکھا تھا

سہج کو کٹھن بنا رکھا تھا
سیدھ میں ٹیڑھ لگا رکھی تھی

برھما نند سہودر کویتا
کو بیکار بنا رکھا تھا

اڑ بڑ شبد گڑھے کچھ ایسے

سیدھی سادی باتوں میں بھی
چھوٹی اینٹھن دے رکھی تھی

جن کو جنتا سیکھ نہ پائے
جن کو جنتا بول نہ پائے
جن کو جنتا سمجھ نہ پائے
جن کو جنتا سن ڈر جائے

کوش گھونٹ لینے والوں کا
سطریں پڑھ لینے والوں کا
قلم پکڑ لینے والوں کا
کاغذ رنگ دینے والوں کا

گٹ پٹ کر لینے والوں کا
اک دربار سجا رکھا تھا
گیان سبھتا کا اپنے کو
ٹھیکے دار بنا رکھا تھا

یاروں نے ہڑبونگ مچا کر
ڈھونگ رچا کر سوانگ رچا کر
تنتر، منتر، چھومنتر سے
ہوا بنا دیا، ودّیا کو

سرسوتی کے مندر کو بھی
بنا دیا مچھلی بازار
ودّیا کے پوتر منڈپ میں
جب ہم ہاتھ جوڑ کر جاتے

پنڈت ہم کو دھتا بتاتے
ہم منہ دیکھتے رہ جاتے تھے
یہی سوچتے رہ جاتے تھے
ہم نردھن کنگالوں سے

صرف لکشمی نہیں خفا ہے
سرسوتی بھی روٹھ گئی ہے
ہم سے سب کرتے ہیں چھوت
اب تک یہی رواج رہا ہے

اونچی ذات، اونچے گھر والے
پیسے والے اوپر والے
ودیا حاصل کر سکتے تھے
لکھ سکتے تھے پڑھ سکتے تھے

اُن کے بچے ہو سکتے تھے
چچا بھتیجے ہو سکتے تھے
بھائی بھانجے ہو سکتے تھے
جج، کلکٹر اور کمشنر

راج سبھا کے چوکس ممبر
ڈاکٹر اور وکیل بیرسٹر
انجنیر، ٹیچر، پروفیسر
وائس چانسلر اور چانسلر

فوج کے نائک فوج کے افسر
بینک ڈائرکٹر، بینک منیجر
کمپنیوں کے شیر ہولڈر
ایم اے، بی اے، بی ٹی، سی ٹی

باگی راگی، رتن پارکھی
کلاکار، گیانی وگیانی
پترکار، لیکھک لاثانی
چترکار شاعر، سیلانی

ویر، سورما دھرمی، دانی
آٹھوں گانٹھ، کمیت جوانی
جس کی چھپی نہیں جائے بکھانی
"گرا انین نین بین بانی"

لیکن کب تک یہ من مانی
یارو دنیا آنی جانی
کس برتے پر تتا پانی
اب نہ چلے گی آنا کانی

"کا برکھا جب کرشی سکھانی
سمے چوکی پنی کا پچھتانی"
اب یہ سب دنیا بدلے گی
اب یہ سب کایا پلٹے گی

اب یہ دھرتی کروٹ لیگی
اب کسان مزدور کے بچّے
جن کو تم نے سڑا رکھا تھا
جن کو گدھا بنا رکھا تھا

سب کچھ پڑھ لکھ کر نکلیں گے
یہی سجائیں گے ہر کرسی
یہی سنبھالیں گے سب عہدے
تلوار اور قلم دونوں کو

اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے
کلا ونت بھی کلا کار بھی
اب ہوگی ان کی سنتان
اب کسان، مزدور اور افسر

سیناپتی، جرنیل، منسٹر
بڑے وزیر گورنر جنرل
یہ سب ایک ورگ کے ہونگے
بھید بھاؤ سب مٹ جائیں گے

ایک اچھید، ابھید، اکھنڈ
ایک سجیو، سیوگ سماج

بھارت میں آنکھیں کھولے گا
نئی سبھیتا قائم ہوگی

مزدوروں کاریگروں، شلپی کاروں کی للکار

توڑا دھرتی کا سناٹا
کس نے؟ ہم مزدوروں نے
ڈنکا بجا دیا آدم کا
کس نے؟ ہم مزدوروں نے

دنیا کی اندھی نگری میں
جگ مگ دیپ جلایا کس نے؟
جگ میں رنگا رنگ چما چم
یہ بازار سجایا کس نے؟

اوٹ میں چھپی ہوئی تہذیبوں
کا گھونگھٹ سرکایا کس نے؟
شرمیلی تقدیر کی دیوی
کا آنچل ڈھلکایا کس نے؟

کام چور سپنوں کی کایا
میں شعلہ بھڑکایا کس نے؟
بدن چور اس پرکرتی کا منی
کا سینہ دھڑکایا کس نے؟

پرت پرت کو اس دھرتی کے
ساتھی، کھول دیا ہے کس نے؟
چھپے دفینوں پر قدرت کے
دھادا بول دیا ہے کس نے؟

جیون کے سمدر منتھن میں
ہم نے بھنور کیا ڈالے ہیں
بھوساگر سے ان ہاتھوں نے
کیا کیا رتن نکالے ہیں

بن۔اپون تھے ہر کانٹے سے
ہنستا پھول کھلایا کس نے؟
پتھر کے پتھریلے دل کو
تپ تپ کر پگھلایا کس نے؟

اس اوسر بنجر دھرتی پر
دھن کا ڈھیر لگایا کس نے؟
اس بھوکی پیاسی دنیا میں
ہُن پر ہن برسایا کس نے؟

ہر آفت سے ہر مشکل سے
مزدوروں کی جوڑ رہی ہے
الٹی پلٹی، آڑی ٹیڑھی
تقدیروں سے ہوڑ رہی ہے

کیا یہ وہی دنیا ہے ساتھی
کل جو پھٹے حالوں پھرتی تھی؟
کیا یہ وہی بیچاری ہے جو
بار بار اٹھ کر گرتی تھی؟

ساتھی بول لبو کھولا کر
جیون روپ رچایا کس نے؟
اس ننگی، اُجڑی دنیا کو
سج کر دولہن بنایا کس نے؟

نیہ جیسی شکھروں پر ساتھی
ہم بے کھٹکے چڑھ جاتے تھے
جہاں موت جاتے ہوئے جھجکے
تال ٹھونک کر بڑھ آتے تھے

آکاشوں کے پاتالوں کے
دل کا چور نکالا کس نے
خالی تھا بھر کر چھلکایا
اس جیون کا پیالا کس نے

اپنی کمر کے بوتے سے ہم
پینگ چڑھاتے ہیں جیون کی
دو جھٹکوں میں ہلا کر رکھ دیں
ساکھی چولیں اندراسن کی

سرکش پنچ بھوت کا گٹھا
ہم نے جھٹک کر توڑ دیا ہے
جس قسمت کی مار غضب تھی
اُس کا پنجہ موڑ دیا ہے

دہر کی ہر تخریبی قوت عہ
کو سانچے میں ڈھال لیا ہے
قدرت کے چیلنج کا ہم نے
کلا توڑ جواب دیا ہے

عہ دنیا کی ہر وناش کاری شکتی

خون پسینے کے ہلور میں
تدبیریں منہ دیکھ رہی ہیں
اس لہراتے آئینے میں
تقدیریں منہ دیکھ رہی ہیں

لاکھ جتن سے جیوں کھیتی
مرجھانے سے کس نے روکا؟

اپنے کس بل سے سینوں میں
طوفانوں کو بند کیا ہے
سدھے ہوئے سوسو ہاتھوں سے
بھونچالوں کو تھام لیا ہے

سورج کی اس اگن گیند کو
کس نے اچھالا؛ لوکا کس نے؟

کئی بار رہتی دنیا کی
آئی کو ہم ٹال چکے ہیں
کئی بار تقدیر جہاں کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال چکے ہیں

جب فاقوں پر فاقے تھے
جب کوئی امید نہیں تھی
ہم نے جہاں انگلیاں رکھ دیں
نبضیں چلنے لگیں دنیا کی

اس ادھ مری دلت دنیا کو
اپنے لہو سے امر کیا
سن لینا، رن بول اُٹھے گا
موت کو اپنے جیت لیا

جس دم ہلہ بول دیا ہے
دریا، صحرا کانپ اُٹھے ہیں
ہم سے ٹکرلے کر، ساتھی
پربت، ساگر ہانپ اُٹھے ہیں

چاند اور سورج کی کرنوں سے
چادر بُن کر رکھ دیتے ہیں
اسی ہتھوڑے کی ضربوں سے
لوہا دُھن کر رکھ دیتے ہیں

کرکے برابر رکھ دیتے ہیں
اوبڑ کھابڑ پیچ و خم
کڑے کوس نرما دیتے ہیں
اپنے دھرتی توڑ قدم

یوں گد گدا دیا ہے ہم نے
سنگ کا پہلو پھڑک رہا ہے
یوں اُکسایا ہے جڑتا کو
پتھر کا دل دھڑک رہا ہے

ذرا ٹھیس لگتے ہی ساتھی
نیند کی دنیا جاگ اٹھتی ہے
ٹھکرا دیں جس پڑی شلا کو
بن کے اہلیا جاگ اٹھتی ہے

جان ڈال دی تصویروں میں
یوں ہر خط چمکایا ہم نے
لو دے اُٹھتے ہیں وہ نقطے
چوم لیا ہے جن کو قلم نے

نام ابھرنے کا نہ کبھی لے
پیچ و خم میں نگاہ جو ڈوبے
نقاشی کے امر معجزے[۱]
مینا کاری کے وہ عجوبے

چوڑی برجوں کو جو دیکھے
شق القمر[۲] یاد آجائے

ان ہاتھوں کی گلکاری میں
صبح بہار سانس لیتی ہے

بت خانوں کے روپ نگر میں
سحر سامری[۳] غش کھا جائے

سم نے دیا دی ہیں وہ آنچیں
مٹی لو پر لو دیتی ہے

۱؎ معجزے : چمتکار
۲؎ شق القمر : محمد صاحب نے ایک بار اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے تھے ۳؎ سحر سامری : جادوگر کا جادو

یوں جگمگا دیا دھاتوں کو

ہو ٹھہراؤ یہ چال کا دھوکا
صاف آنکھوں کو ہو جاتا ہے
چاندؔ پر سیّالؔ کا دھوکا

بیل اور بوٹوں کے پردے میں
ہم نے کیا کیا کام کئے ہیں
منہ بندھی کلیوں کی گرہوں میں
ہم نے شعلے باندھ دئے ہیں

انھیں کھردرے ہاتھوں کا حس ہے

یا صناعیؔ بول اٹھی ہے
دیکھ ذرا بچوں کے کھلونے
ساکتی مٹی بول اٹھی ہے

محرم آب رواں چھنتی ہے*
سات تہوں سے بدن کی جیوت؟
پردے پردے میں رہ رہ کر
جیسے جاگے من کی جیوت؟

*: شہزادی زیب النسا اورنگ زیب کے دربار میں ڈھاکہ کا آب رواں سات تہہ کر کے پہن کر آئی تھی۔ تب بھی اورنگ زیب نے کہا تھا، "بیٹی تم ننگی ہو۔"

لہ جاند: چڑھ۔ سیال: ترل سہ صناعی: شِلپی کلا

بارہ ابرنگ سولہ سنگار
گوکل کی رادھا سجتی ہے
اس دنیا کے برندا بن میں
کس کی بنسی بجتی ہے

کوکھ اُجڑ جائے دھرتی کی
پھوٹ جائے مانو کا بھاگ
یاد رہے ہم اٹھ جائیں تو
لٹ جائے دنیا کا سہاگ

ہاتھ ہمارا ہی گھر گھر میں
لے کے چراغ شام آیا ہے
بنیادوں سے ردا ردا
خون ہمارا کام آیا ہے

کڑی چٹانوں کے تیشے سے
ہم نے سینے پھاڑ دئے ہیں
چار کھونٹ رہتی دنیا میں
ہم نے جھنڈے گاڑ دئے ہیں

اس دھرتی کو چھو کر ہم نے
چاند ستاروں کو چھیڑا ہے
کرکے بسر کانٹوں پر ساتھی
ہم نے بہاروں کو چھیڑا ہے

اپنے ارادوں کی اٹھان میں
روح تمدّن کی برنائی

اکثر اس دھرتی کی چھوٹیں
دیوک لوک پر پڑ جاتی ہیں
آج اسی دنیا کی آنکھیں
اندر پوری سے لڑ جاتی ہیں

انھیں ہتھوڑوں کے سرگم میں
تاریخوں نے لی انگڑائی

موہن جداڑوں اور ہڑپّا
لال قلعہ اور تاج محل
دیکھ ایلورا اور اجنتا
کپل وستو کا راج محل

روم و یونان کی وہ فنکاری
مصر دیش کے وہ اہرام
قسطنطنیہ کے کنگورے
قصر کے، قصر بہرام

کاشی، دلی، ایلیم،[1] پیسا
کے وہ دھور ہرے مینار
اجین اور شیراز اور غزنی
الحمرا کے در و دیوار

نیلے سپنوں کی جھلمل میں
اٹلانٹس[2] کا وہ جل سیج
جگ جگانتر کے ورثے کو
پیڑھی پیڑھی دیا سہج

ماریشس، کینیا، ٹنگا نیکا
لنکا، بنکا، سنگاپور
یہ کس نے لہلہا دیا ہے
جل تھل کو نزدیک اور دور

[1] ایلیم ۔ ٹرائے نگر کا ایک نام ایلیم بھی ہے ۔ پیسا نگر اٹلی میں ہے جہاں کا ترچھا مینار مشہور ہے
[2] کہا جاتا ہے کہ اب سے کئی ہزار برس پہلے اٹلی میں روم ساگر کے تٹ پر اٹلانٹس نامی ایک بہت بڑا نگر بسا ہوا تھا جو اچانک روم ساگر میں ڈوب گیا۔

جھلک رہا ہے نگر ماسکو
نویگ کا وہ جروسیلم
وہ جادو نرمان کلا کے
لینن گراڈ اور نیپر ڈین[1]

بھو منڈل پر جگ کا جگ سے
رشتہ ناتا جوڑ آئے ہیں
قدم قدم پر اِس دنیا میں
اپنی نشانی چھوڑ آئے ہیں

صحرا کو جو چمن بنا دیں
ایسے دیوانے کم ہوں گے
آنکھ اُٹھا کر حدِّ نظر تک
دیکھو گے تو ہمیں ہم ہوں گے

"پتہ پتہ ، بوٹا بوٹا
حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے
باغ تو سارا جانے ہے"
(میرؔ)

[1] روس میں نیپر ندی کے باندھ پر پانی کا سب سے بڑا خزانہ

گھن گھن گھن اُن گنت مشینوں
کے پہیوں کا چکر کھانا
یہ گھڑ گھڑ گھڑ، یہ زیر و بم
پیاروں کا مل کر گانا

لاکھ کروٹیں لیتا شعلہ
بجر کو بھی پگھلا دیتا ہے
بوائلر ہونک رہا ہے گویا
جوالا مکھی سانسیں لیتا ہے

دھڑ دھڑ جلتے فرنس سے
سورج منڈل جھپک گیا ہے
اندھکار کے سینے میں بھی
اکثر کوندا لپک گیا ہے

برساتی ہیں پھول انجن کے
لال انگاروں کی بوچھاریں
سنو کھنکتے کل پرزوں میں
صوت سرمدی کی جھنکاریں

یہ مشین کی گڑگڑاہٹیں
دھرتی کی چھاتی ہل جائے
دھواں چمنیوں سے اٹھتا ہے
گت پر جیسے ناگ لہرائے

جیون کی کالی راتوں کا
دھرتی جہاں پتہ دیتی ہے
گاتی ہوئی مشینوں کی لے
وہاں چراغ جلا دیتی ہے

ریلوں کی گھن گرج، جہازوں
کا وہ ساگر پھاڑ بڑھاؤ
صاف منڈلاکار فضا میں
طیاروں کا نڈر چڑھاؤ

ندیوں کا منہ موڑ دیا ہے
ویرانہ لہراتا ہے
ریگستانوں میں اب پانی
گگن کھیلتا جاتا ہے

مزدوروں کے کرامات ہیں
مزدوروں کے پست و بلند
کس کروٹ سے چندرلوک پر
پھینکی ہے بے لاگ کمند

ہم دنیا کو چلانے والے
اور ہیں پامال، یہ کیا ہے؟

کرم یوگ کی مہاشکتی کو
ہم نے اپنے ساتھ لیا ہے
اِس جیون کے شیش ناگ کو
اِن ہاتھوں نے ناتھ لیا ہے

ہم دنیا کو بچانے والے
اور اتنے بدحال، یہ کیا ہے؟

ہم کو بھوکا رکھ کر ہم سے
دھن کبیر کا کام لیا ہے
اپنی دشا سوچ کر اکثر
ہم نے کلیجہ تھام لیا ہے

ساتھی مرتا کیا نہیں کرتا
کس کس پر الزام دھرے
جم جم جیئے یہ پیاری دنیا
لیکن ہم بے موت مرے

سب اپنی ہی گھما گھمی ہے
آئے دن جو مال اُڑتے ہیں

اپنے پسینے کا جم جانا*
دھن، پونجی، سرمایہ داری
سب اپنے ہی لہو سے پلے ہیں
سیٹھ مہاجن، راج ادھیکاری

سب اپنی ہی لہر بہر ہے
اپنے لہو سے گلال اُڑتے ہیں

ہم کو نردھن رکھ کے انھوں نے
پاٹ لئے ہیں اپنے خزانے
ہمیں اُجاڑ کے ان سیٹھوں نے
سجا لئے اپنے کاشانے

* "CAPITAL is CONGEALED lABOUR" MARX.

باغ میں بس اِن کو زہریلے
کانٹے بونا آتا ہے
اِن کے انرتھ کو دیکھ دیکھ کر
ساتھی رونا آتا ہے

کیسا اپنا دیس اپنا گھر
ساتھی اپنا بس ہے اُتنا
چھٹے ناخنوں میں جتنا ہے
ٹکڑا بھارت کی مٹی کا

پانی میں یہ آگ لگا دیں
سیٹھ، مہاجن، ایک کائیاں
جنگ کی گھاتیں صلح کی باتیں
دھما چوکڑی اُڑن گھائیاں

جب جب جنگ چھڑی دیشوں میں
جو بھی پڑی ہم پر ہی پڑی
بھُس میں چنگی دیکر ساتھی
دیکھ جمالو دور کھڑی

اربوں کے ہیں وارے نیارے
دانوں بھی ہیں دوھرے دوھرے
چالیں اِن کی بازی اِن کی
ہم ہیں بس شطرنج کے مہرے

یہ اور اُگلیں اپنا منافع؟
کہہ سن کر سب ہار گئے
نوٹوں کے، سونے چاندی کے
یہ تو پہاڑ ڈکار گئے

یہ ہم سے اِنصاف کریں گے؟
کیا بکتے ہو؟ ــــ رام کہو
اِن کے بہی کھاتے سے ہیں کیا
لیتا ایک ــــ نہ دینا دو

نرم کبھی پڑ کے گرم کبھی پڑ کے
دنیا کو دیتے ہیں بھرّے
یہ جیون کا رتھ کھینچیں گے؟
راہ کے اَڑیل تھان کے ٹرّے

کالے روپوں سے بے کھٹکے
بھرتے گئے یہ اپنی تجوری
سب بھو چکے رہ جاتے تھے
کرتا کون اِن سے برجوری

پنٹو اب بپھری جنتا سے
کرنی دھرنی لے کر چالو

یہ سب مردم خور ہیں ساتھی
ان کے ساتھ مروّت کیسی
یہ دنیا ہے اِن کی ملکیت
اِس دنیا کی ایسی تیسی

مٹھی بھر بھر کے دنیا میں
بوئی ہوا، یونڈر کا لو

سنگینوں سے بندوقوں سے
تم نے کئے ہزاروں وار
باری ہے اب مزدوروں کی
"اک کچلو ہیا آڑو ہمار"
(آلہا)

دب سٹھ سے کب کام چلا ہے
لوہا ہی لوہا کو کاٹے
ساتھی سنا نہیں کیا تو نے
سیدھے کا منہ کتّا چاٹے

کھیتوں میں کھڑک کھمب میں
سب میں بیاپے ہم ہشیار
انھیں ڈیوڑھیوں کے کھمبوں سے
لیں گے ہم نرسنگھ اوتار

بیکاری، بھوک مری، لڑائی
رشوت اور چور بازاری
بے بس جنتا کی یہ ڈرگت
سب کی جڑ سرمایہ داری

ٹھوکر پر ٹھوکر کھا کر بھی
اپنی منزل سے بیگانے
آنکھ کے اندھے نام نین سکھ
ہم کو چلے ہیں راہ بتانے

آج بھی کھاتے والوں سے
صدیوں کا لیکھا ہم لیں گے
آٹے دال کا بھاؤ کھلے گا
جب دم جمع خرچ سمجھیں گے

لال ، جواہر ، سونا ، چاندی
کو نٹانگ پر کیا نچھاور
کیوں نہ ہو؟ ڈالر سامراج کا
ناچ رہا تھا بھوت جو سر پہ

اس دولت سے امریکہ کا
جوبن اور سنوارا ہوتا
آج امریکہ ایک زمانے کی
آنکھوں کا تارا ہوتا

بینکوں ، ملوں ، کارخانوں کو
ہم جو ہاتھوں میں لے لیتے
ہُن برسا دیتے ساتھی ہم
دیش کو سونے میں مڑھ دیتے

یو۔این۔او۔میں یونیسکو میں
روس پہ دوش لگاتے جاؤ
کرکے بے حیا تقریریں تم
اپنی جھینپ مٹاتے جاؤ

جاپان اور پچھمی جرمنی
یونان، اٹلی، یوگوسلاویا
کشمیر اور نیپال اور تبت
ساوتھ کوریا اور ملایا

توڑ پھوڑ میں حرج نہیں ہے
کچھ تو کریں جب جی للچائے
چور اگر چوری نہ کرے تو
ہیرا پھیری سے کبھی جائے

چین کو مت تسلیم کرو
یاروں نے ڈھب کیا کیا سوچے
ٹھیک تو ہے، کھسیانی بلی
کچھ نہ بنے تو کھمبا نوچے

اب نارموسا پر نظریں ہیں
گو یہ جگہ ہے نہایت چھوٹی
لیکن اب اِس کو کیا کیجئے
بھاگے بھوت کو بہت لنگوٹی

چین سے جب نکلے تو تم نے
ہند چین میں ٹانگ اڑائی
ڈٹ گئے نئے اکھاڑے میں تم
اور جو یہاں کبھی منھ کی کھائی

مارشل ایڈ، اٹیلانٹک پیکیٹ
خانے تڑ پڑ بھرتے جاؤ
اسی طرح دنیا بھر میں تم
گڑ بڑ سڑ بڑ کرتے جاؤ

وال اسٹریٹ کے سٹے بازو
کانپ جاؤ اس لشکر سے
ہٹلر، چیانگ کے اڑا دئے سر
جس نے اپنی ٹھوکر سے

جنگ سے تم کو لابھ ہوا جو
اُس کو چھوڑو اور شرماؤ
کنٹھ میں اٹکیں جیت کے دعوے
گنو اگر تم روس کے گھاؤ

زبردست جرمن فوجوں سے
لڑے اکیلے تم یا روس؟

تم نے ہٹلر کو شکست دی
کہتے شرم نہیں آتی؟
اِتنے دانت تمھارے منھ میں
جھوٹ کی آنکھیں ہیں جھک جاتی

جیتے ہوئے دشمن کو بھگاتے
برلن پہنچے تم یا روس؟

نگل لئے جانے پر کس نے
پیٹ اجگر کا پھاڑ دیا ہے؟
سب سے پہلے رائخس ٹاگ پر
کس نے جھنڈا گاڑ دیا ہے؟

آج روس پھنک جانے پر بھی
پتپ اٹھا ہے چمک اٹھا ہے
تم پر آنچ نہ آئی لیکن
باغ تمھارا سوکھ چلا ہے

دنیا بھر بازار ہے جس کا
اک منڈی ہیرا پھیری کی
اس امریکہ کی یہ حالت
یہ بیکاری دھت تیری کی*

ٹھنڈی لڑائی آخر کب تک
اک دنیا سے رہے گی جاری
امن کے سچے دلداروں سے
بات نہ کی تم نے جھک ماری

دُم میں رسّا باندھ چکے ہیں
ٹھوکر دیں گے، دھکا دیں گے
اسی گھڑی ہم دم لیں گے جب
چور کو گھر تک پہونچا دیں گے

*اس وقت امریکہ میں ایک کروڑ مزدور بیکار ہیں۔

اَب کیوں دیر لگائیں ساتھی
اب تو کمر دشمن کی خم ہے
آدھی دنیا جیت چکے ہیں
اَب تو منزل چار قدم ہے

دنیا نئی بسائیں گے ہم
سندر ساج سجا دیں گے
دھنّا سیٹھوں کے محلوں کی
اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے

دنیا ہاتھ نہیں آتی ہے
دنیا لے لی جاتی ہے
قسمت نہیں بدلتی ساتھی
قسمت بدلی جاتی ہے

مزدوروں کی دنیا جاگی
کٹتے کٹتے رات کٹی
وہ آکاش کلس ہلتے ہیں
دھرتی نے کروٹ بدلی

دنیا جسے "آج" کہتی ہے
سنگم کئی مجگوں کا ہے
بیتا ہوا "کل" اوروں کا تھا
آنے والا "کل" اپنا ہے

سرودے کے سکھ سپنے میں
کون پکار رہا ہے ساتھی؟
جیون ساگر نئی دشا میں
ٹھاٹھیں مار رہا ہے ساتھی

کوئی دن کی بات ہے ساتھی
مزدور اب مجبور نہیں ہے
جب ہو زمیں پر اپنی خدائی
ساتھی وہ دن دور نہیں ہے

نئی دنیا

روس چین کی کمپت کریں
نو پربھات کی آبھا لائیں
نوجگ کا سندیسہ لائیں

اتر ، دکھن ، پورب ، پچھم
آگے ، پیچھے ، اوپر ، نیچے
دیش دیش میں دنیا بھر میں
توڑ رہی ہے دم تاریکی
سُرخ سویرا ہونے کو ہے

بھارت کے آکاش میں ساتھی
اُدیاچل کی اوٹ سے ساتھی
وہ رکتم پو پھوٹ رہی ہے

انگڑائی توڑتا ایشیا
بند آنکھیں ملتا افریقہ
دمن دلت حبشی امریکہ
گہری نیند سے چونک اٹھے ہیں

دیش دیش میں مہا کرانتی کی
رن چنڈی ، ہنکار رہی ہے
سو بل کھاتی ہوئی کچل کر
یا ناگن پھپکار رہی ہے

کاریگر مزدور کسان
کڑیل اور بگڑیل جوان
کاندھے سے کاندھا جوڑیں گے
دنیا پر دھاوا بولیں گے

دھرتی کا تختہ اُلٹیں گے
دنیا میں سروودے ہو گا
نیا سماج آنکھیں کھولے گا
نئی سبھیتا قائم ہو گی

ذرہ ذرہ جاگ اُٹھے گا
قطرہ قطرہ جاگ اُٹھے گا
پتہ پتہ جاگ اُٹھے گا
بوٹا بوٹا جاگ اُٹھے گا

کونا کونا جاگ اُٹھے گا
چپہ چپہ جاگ اٹھے گا
تپہ تپہ جاگ اُٹھے گا
قصبہ قصبہ جاگ اُٹھے گا

صوبہ صوبہ جاگ اُٹھے گا
دریا دریا جاگ اٹھے گا
صحرا صحرا جاگ اٹھے گا
جیون سپنا جاگ اُٹھے گا

دکانِ سخن

خرید و مکاں، لامکاں بیچتا ہوں
شہنشاہی دو جہاں بیچتا ہوں

حقائق عیاں اور نہاں بیچتا ہوں
یونہی چند وہم و گماں بیچتا ہوں

میں نغموں کی جنس گراں بیچتا ہوں
ترے حُسن کی داستاں بیچتا ہوں

اشارات قلبِ تپاں بیچتا ہوں
یقیں بیچتا ہوں گماں بیچتا ہوں

جو آسودۂ خواب ہے اُن لبوں پر
وہ رنگینیٔ داستاں بیچتا ہوں

جھپکنے لگیں آفتابوں کی آنکھیں
ترے رُخ کی تابانیاں بیچتا ہوں

جو لپٹی ہیں اس گیسوئے عنبریں سے
میں اُن نکہتوں کا دھواں بیچتا ہوں

دلِ لعل کو چیرتی جا رہی ہے
صداقت کی نوکِ سناں بیچتا ہوں

جو چشم و چراغِ شبِ زندگی ہے
میں اشکوں کی وہ کہکشاں بیچتا ہوں

کبھی وقت بے وقت کام آ رہے گا
خرید و غمِ رائیگاں بیچتا ہوں

کوئی نرخ اٹھائے متاعِ سخن کے — میں دل بیچتا ہوں زباں بیچتا ہوں

زمینِ سخن بیچنے کے بہانے — خیالات کے آسمان بیچتا ہوں

خیایاں خیاباں چمن می فروشم — میں ہر برگ کو گلستان بیچتا ہوں

جو چھیڑوں تو لوٹے اٹھے سازِ ہستی — میں وہ سوزِ دل سوزِ جاں بیچتا ہوں

زمانے میں جو غم ملے دوستوں سے — انھی کو میں اے مہرباں بیچتا ہوں

جو ہیں غنچہ و گل کے پردوں میں پنہاں — میں وہ نغمۂ بلبلاں بیچتا ہوں

الجھنیں میں ہیں آسانیوں کے بھی ٹکے — محبت کی دشواریاں بیچتا ہوں

برابر کریں جو حساب زمانہ — میں کچھ ایسے سود و زیاں بیچتا ہوں

جھپک جائیں مہر قیامت کی آنکھیں — وہ قامت کی برقِ دماں بیچتا ہوں

ازل سے جو پنہاں ہے رازِ بہاراں — وہی گلستاں گلستاں بیچتا ہوں

یہ اعجازِ فن قدر و قیمت بڑھا کر — نشاط و غمِ دیگراں بیچتا ہوں

جو آئے نہیں ہیں کتابوں میں اب تک — ان ابواب کی سرخیاں بیچتا ہوں

دو عالم بھی دے کر ملیں تو ہیں سستے — حقائق کے گنجِ نہاں بیچتا ہوں

جو اس دور کے فتنۂ بے اماں کو — سلا دے وہ خوابِ گراں بیچتا ہوں

جہاں بال جلتے ہیں رُوح الامیں کے — میں اس دل کے سوزِ نہاں بیچتا ہوں
مفر ہو نہ جس سے قضا و قدر کو — خریدو کہ وہ امتحاں بیچتا ہوں
جو بیچین دنیا میں جانِ سکوں ہے — میں وہ درد آرامِ جاں بیچتا ہوں
وجود و عدم تنگ گوشے ہیں جس کے — میں وہ وسعتِ بیکراں بیچتا ہوں
مرے شعر تر ہیں گلستاں کے آنسو — غمِ خاطرِ شادماں بیچتا ہوں
جنوں خیز ہے تار تارِ گریباں — میں اس جیب کی دھجیاں بیچتا ہوں
شفا ہو نہ جس کو مسیحا دموں سے — عزیزو وہ زخمِ نہاں بیچتا ہوں
صفیں رنگ و بو کی غزل میں سجا کے — گلوں کی دُکاں کی دکاں بیچتا ہوں
فضائے جناں گرد ہے جن کے آگے — اِن اشعار میں وہ سماں بیچتا ہوں
وجود ایک سوزِ مسلسل ہے جس سے — میں اس عشق کی گرمیاں بیچتا ہوں
مرے سازِ دل میں صدائے جرس ہے — جسے کارواں کارواں بیچتا ہوں
چراغِ سخن ہیں کہ کچھ نقشِ پا ہیں — تری رہگذر کے نشاں بیچتا ہوں
بنے شوقِ دیدار شوقِ شہادت — میں وہ جلوۂ جانستاں بیچتا ہوں
اک اک لمس جس کا شعاعوں سے نازک — میں وہ فنِّ شیشہ گراں بیچتا ہوں

وہ دوست اُس کی جو قدر و قیمت نہ جانیں — انھیں کو غمِ دوستاں بیچتا ہوں
حقائق ہیں کچھ، خامشی و سخن کے — جنھیں درمیاں درمیاں بیچتا ہوں
مرے اک فسانے میں لاکھوں فسانے — جنھیں داستاں داستاں بیچتا ہوں
سبھی برق وش جن کی چنگاریاں ہیں — میں وہ آگ اے جانِ جاں بیچتا ہوں
اسے مول لیکر خدائی کرو گے — خرید و زمین و زماں بیچتا ہوں
سراسر ترے حسن کا پردہ رکھ لیں — میں وہ چاک دامانیاں بیچتا ہوں
کئی راز ہیں جو یقیں در یقیں ہیں — انھیں کو گماں در گماں بیچتا ہوں
جسے چاندنی رات بھی ڈھونڈتی ہے — میں وہ جلوۂ مہ وشاں بیچتا ہوں
جو ہیں کار فرما ضمیرِ بشر میں — وہ رحمان وہ قہرماں بیچتا ہوں
جو ہے جان و ایماں سے بھی بڑھ کے مجھکو — میں اس دل کے ٹکڑوں کو ہاں بیچتا ہوں
حیاتِ بشر کے ہیں کچھ رمز جن کو — شر و خیر کے درمیاں بیچتا ہوں
زمیں کو بناتی ہے جو رشکِ جنّت — خریدو وہ سرگرمیاں بیچتا ہوں
جو آتی ہے فرسودہ نظمِ جہاں پر — میں وہ آفتِ ناگہاں بیچتا ہوں
پیامِ انقلابوں کا جھنکار جس کی — وہ زنجیرِ زندانیاں بیچتا ہوں

ملے تجھ یہ غم مجھ کو اے دوست تجھ سے — جنھیں شادماں شادماں بیچتا ہوں

بہت سی محبت کی ناکامیاں ہیں — جنھیں کامراں کامراں بیچتا ہوں

یہ ہیں خطِّ روشن جبینِ وطن کے — میں تقدیرِ ہندوستاں بیچتا ہوں

مرے دل پہ لہرا کے جو ٹوٹتی ہیں — اداؤں کی وہ بجلیاں بیچتا ہوں

پڑیں لمحہ لمحہ پہ مہریں ابد کی — میں وہ وقفہ ہائے نہاں بیچتا ہوں

کمندِ چمن ہے لچک خوشبوؤں کی — خمِ زلفِ عنبر فشاں بیچتا ہوں

زمینِ سخن گل کھلاتی ہے کیا کیا — جنھیں آسماں آسماں بیچتا ہوں

فراقؔ اک خریدار پر ہیں نگاہیں
میں یکمشت دونوں جہاں بیچتا ہوں

بانٹ رہا ہوں

اے اہلِ طرب رنج و الم بانٹ رہا ہوں
خوشیاں بھی ہوں قربان وہ غم بانٹ رہا ہوں

اک شعلۂ اعجاز رقم بانٹ رہا ہوں
ہے نوک پہ جادو وہ قلم بانٹ رہا ہوں

ہے موت سے بھی سازوہ ہوں زندۂ جاوید
امرت کے اُڑیں ہوش وہ سم بانٹ رہا ہوں

چھیڑی وہ غزل میں نے کہ ہیں وجد میں کونین
اور یوں تو کوئی کیف نہ کم بانٹ رہا ہوں

ہے مسکنِ آہوئے ختن ہر دل پر کیف
جادو بھری آنکھوں کا بھرم بانٹ رہا ہوں

پڑتی ہیں سرِ عالمِ اسرار کمندیں

لہرائی ہوئی زلف کے خم بانٹ رہا ہوں

افکار مرے چیر گئے سینۂ آفاق

اشعار ہیں یا تیغِ دو دم بانٹ رہا ہوں

اس پردۂ آواز سے پو پھوٹ رہی ہے

فردا کے جلوسوں کے علم بانٹ رہا ہوں

یہ مہر و وفا کے جو سناتا ہوں ترانے

اے دوست ترے لطف و کرم بانٹ رہا ہوں

کروٹ نئی لیتے ہیں زمانے کے ارادے

دنیا میں نئے قول و قسم بانٹ رہا ہوں

کھاتا ہوں شہنشاہئ جمہور کی سوگند

میں سلطنتِ قیصر و جم بانٹ رہا ہوں

چونکا نہ دیں ایمان کو یہ کفر کے تحفے

بول اُٹھنے کو ہیں جو وہ صنم بانٹ رہا ہوں

لیتی ہے مری بات کو کچھ یوں نئی دنیا
جیسے کوئی انمول رقم بانٹ رہا ہوں

اشعار کی یہ چستیٔ بندش ہے بہانہ
اے دوست تری شوخیٔ رم بانٹ رہا ہوں

یہ نغمہ سرائی ہے کہ دولت کی ہے تقسیم
انسان کو انسان کا غم بانٹ رہا ہوں

جس سے مرے وجدان میں پلتے ہیں خیالات
جمہور میں وہ نازو نعم بانٹ رہا ہوں

انفاسِ خزاں دیدہ کو شعلوں میں بسا کے
ویرانوں کو گلزارِ ارم بانٹ رہا ہوں

پیشانیٔ مستقبلِ انساں ہے منوّر
وہ شعلے سرِ دیر و حرم بانٹ رہا ہوں

اے اہلِ عرب آؤ ان اشعار کو پرکھو
کچھ سوچ کے میراثِ عجم بانٹ رہا ہوں

میعارِ سخن اس سے چمک جائے تو ہے بات
جس دولتِ افکار کو کم بانٹ رہا ہوں

ہر دیدہ مشتاق میں شبنم کی جھلک ہے
آنکھوں میں جو پنہاں ہے وہ نم بانٹ رہا ہوں

خلاقِ تمدن ہے یہی نیستیٔ عشق
ہستی کو میں پیغامِ عدم بانٹ رہا ہوں

اشعار ہیں یا گنجِ گراں مایۂ فطرت
نغموں کے وہ دینار و درم بانٹ رہا ہوں

یہ تلخ نوائی مری ضامن ہے بقا کی
جو جانِ کرم ہے وہ ستم بانٹ رہا ہوں

تعمیر کریں گے نئی دنیا نئی دنیا
کمزوروں میں وہ زور ہمم بانٹ رہا ہوں

ہر چیز کا چولا ہی بدل دوں گا سرے سے
سنسار کو اک اور جنم بانٹ رہا ہوں

دنیا کو نئے دور کی دیتا ہوں بشارت

یا اک نئی تقدیرِ اُمم بانٹ رہا ہوں

کل جن سے بدلنے کو ہے تقدیر بشر کی

میں آج وہ افکارِ اہم بانٹ رہا ہوں

اے اہلِ ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو

میں مملکت لوح قلم بانٹ رہا ہوں

کھلتا ہی نہیں مجھ پہ فراق اپنی صدا سے

کیا کیا اثرِ شادی و غم بانٹ رہا ہوں

جُدائی

شجر حجر یہ ہیں غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی   سُبک خرام ہواؤں کو نیند آئی ہوئی
رگیں زمیں کے مناظر کی پڑ چلی ڈھیلی   لویں فلک کے چراغوں کی جھلملائی ہوئی
یہ خستہ حالی، یہ درماندگی، یہ سناٹا   فضائے نیم شبی بھی ہے سنسنائی ہوئی
دھواں دھواں سے مناظر ہیں شبنمستاں کے   سیاہ رات کی زلفیں ہیں رسمسائی ہوئی
یہ رنگ تاروں بھری رات کے تنفس کا   کہ بوئے درد میں ہر سانس ہو بسائی ہوئی
خنک اُداس فضاؤں کی آنکھوں میں آنسو   ترے فراق کی یہ ٹیس ہو اٹھائی ہوئی
سکوتِ نیم شبی گہرا ہوتا جاتا ہے   رگیں ہیں سینۂ ہستی کی تلملائی ہوئی
ہے آج سازِ نوا ہائے خونچکاں لے دوست   حیات تیری جدائی کی چوٹ کھائی ہوئی
مری ان آنکھوں سے اب نیند پردہ کرتی ہو   جو تیرے پنجۂ رنگیں کی تھیں جگائی ہوئی
سرشک پلے ہوئے تیرے نرم دامن کے   نشاط تیرے تبسّم سے جگمگائی ہوئی

لٹک وہ گیسوؤں کی جیسے پیچ و تابِ کمند
لچک بھوؤں کی وہ جیسے کماں جھکائی ہوئی

سحر کا جیسے تبسّم دمک وہ ماتھے کی
کرن سہاگ کی بیندی کی لہلہائی ہوئی

وہ انکھڑیوں کا فسوں روپ کی وہ دیوئیت
وہ سینہ روحِ نمو جس میں کنمنائی ہوئی

وہ سیج سانس کی، خوشبو کو جس پہ نیند آ جائے
وہ قد گلاب کی اک شاخ لہلہائی ہوئی

وہ جھلملاتے ستارے ترے پسینے کے
جبینِ شامِ جوانی تھی جگمگائی ہوئی

ہو جیسے تبکدہ آزر کا بول اٹھنے کو
وہ کوئی بات سی گویا لبوں تک آئی ہوئی

وہ دھج وہ دلبری وہ کام روپ آنکھوں کا
سجل اداؤں میں وہ راگنی رچائی ہوئی

وہ خواب گاہ میں شعلوں کی کروٹیں دمِ صبح
وہ بھیرویں تری بیداریوں کی گائی ہوئی

وہ مسکراتی ہوئی لطفِ دید کی صبحیں
تری نظر کی شعاعوں کی گدگدائی ہوئی

لگی جو تیرے تصور کے نرم شعلوں سے
حیاتِ عشق ہے اس آنچ کی تپائی ہوئی

ہنوز وقت کے کانوں میں چھچھاہٹ سی ہے
وہ چاپ تیرے قدم کی سنی سنائی ہوئی

ہنوز سینۂ ماضی میں جگمگاہٹ سی ہے
دمکتے روپ کی دیپاولی جلائی ہوئی

لہو میں ڈوبی اُمنگوں کی موت رو کر ذرا
حریمِ دل میں چلی آتی ہے ڈھٹائی ہوئی

رہے گی یاد جواں ہو گی محبّت کی
سہاگ راگ کی وہ چوڑیاں بڑھائی ہوئی

یہ میری پہلی محبت نہ تھی مگر اے دوست — اُبھر گئی ہیں وہ چوٹیں دبی دبائی ہوئی

سپردگی و خلوصِ نہاں کے پردے میں — جو تیری نرم نگاہی کی تھیں بٹھائی ہوئی

اٹھا چکا ہوں میں پہلے بھی ہجر کے صدمے — وہ سانس دکھتی ہوئی آنکھ ڈبڈبائی ہوئی

یہ حادثہ ہے عجب تجھ کو پا کے کھو دینا — یہ سانحہ ہے غضب تیری یاد آئی ہوئی

عجیب درد سے کوئی پکارتا ہے تجھے — گلا رندھا ہوا آواز تھرتھرائی ہوئی

کہاں ہے آج تو اے رنگ و نور کی دیوی — اندھیری ہے مری دنیا لٹی لٹائی ہوئی

پہونچ سکے گی کبھی تجھ تک مری نوائے فراق
جو کائنات کے اشکوں میں ہے نہائی ہوئی

ہاں اے دلِ افسردہ

(مدائن پر خاقانی کے اُس قصیدے سے متاثر ہو کر جو یوں شروع ہوتا ہے)

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نگہ کن ہاں　　ایوان مدائن را آئینہ عبرت داں

ہاں اے دلِ افسردہ دنیا پہ نظر کر ہاں
یہ جلوہ گہِ فطرت یہ کار گہِ انساں
ہر درد ترے غم کا تاریخ کا اک عنواں
کس درجہ ہے پُر عظمت تیرا یہ غم پنہاں
ہر نعمتِ ہستی ہے تیرے لئے او ناداں
تیرے لئے فطرت کا ہر ایک سرو ساماں

دم سے ترے رونق ہے اس محفلِ ہستی کی
مہر و قمر و انجم تیرے لئے آویزاں
ہے راج گلستاں پر فرمان بیاباں پر
احکام سے تیرے ہی کھلتے ہیں درِ زنداں
ہر خطِ مصوّر میں ہیں دھڑکنیں تیری ہی
ہر نغمۂ شاعر میں تو ہی تو ہے گل افشاں
مہکے ہوئے گلشن میں دہکے ہوئے صحرا میں
ہے جوشِ نمو تیرا تیری ہی تپش پنہاں
تو آگ بھی پانی بھی، تو قہر بھی رحمت بھی
اس گلشنِ عالم میں تو برق تو ہی باراں
تیرے ہی لہو سے ہے گلشن کی حنا بندی
بھیگے ہوئے تنکوں کو شعلے کا دیا داماں
پنہائی ہر عالم تیری ہی وراثت ہے
جاگیر تمری ہی ہے ہر بیشہ و ہر میداں

ہاتھوں میں ترے جس ہے آنکھوں میں تری رس ہے
دھرتی کو کیا گلشن ، بنجر کو کیا بُستاں

ہر برگ پہ احساں ہے ، ہر نخل ترا ممنوں
تو میرِ چمن بنداں ، تو نازشِ گلکاراں

فطرت کے نوشتوں کی اصلاح بھی کی یوں تو
ہر بھول ہوئی تجھ سے ہر سہو خطا کاراں

فطرت کا عمل تجھ پر ، فطرت پہ عمل تیرا
تہذیب و تمدن کے اِس امر میں سب امکاں

اِس باہمی رشتے کے بڑھنے سے لگی آنے
انساں سے بوئے فطرت فطرت سے بوئے انساں

شاگرد بھی فطرت کا ، استاد بھی فطرت کا
تو طفل ابد کا ہے اور تو ہی ابوالدوراں

دنیا کو بدلنے میں تو بھی ہے بدل جاتا
اِس دُہرے عمل کا ہے ہر ردِّ عمل پنہاں

زنجیرِ عمل کی ہی کو نین میں ہیں جھنکا ریں
محدود نہیں کڑیاں ، یہ سلسلہ بے پایاں
راحل ہے ازل کا تو ، سیاح ابد کا تو
کچھ تجھ کو خبر بھی ہے تو کب سے ہے سرگرداں
تنہا نہ سمجھ خود کو ہمراہ ترے اے دل
ہے گرد ثوابت بھی ، سیارے بھی ہیں رقصاں
مہر و مہ و انجم میں ہے عکس فگن تو ہی
اس آئینہ خانے میں اس درجہ نہ ہو حیراں
دنیا ہے وطن تیرا دنیا کا وطن تو ہے
گم کردہ وطن ہو کر از یاد وطن نالاں
ہر دور کے غنچوں کی تجھ سے ہی کھلیں گرہیں
ہر عصر کے دامن میں تو ہی ہے بہار افشاں
تیرے لئے دنیا ہے ، دنیا کے لئے تو ہے
ہاں خود پہ نظر کر کے دنیا پہ نظر کر ہاں

آئینۂ دوراں ہے یہ تیری اُداسی بھی

ہر چین جبیں تیری تاریخ کا اک عنواں

ہر ایک جھجک تیری صد جائے تامل ہے

ہر وہم و گماں تیرا ہے روکشِ صد ایماں

قسمت میں تیری اے دل راحت نہ سکوں لیکن

ہر دکھ کا مداوا تو ، ہر درد کا تو درماں

ہر دورِ سیہ کا ہے تو مطلعِ صبحِ نو

اے مامنِ غم زدگاں اے مونسِ مظلوماں

تیرا ہی جلال اے دل آتا ہے نظر مجھ کو

جب ٹھوکریں کھاتی ہے سرتابیٔ سرتاباں

مردود خلائق بھی ، مسجودِ ملائک بھی

اضداد کا مجموعہ ، گہ نادم و گہ ناداں

تاریخ تمدن کا تو راز ہے سربستہ

اخلاق کا پیغمبر سردار گنہگاراں

معصوم ہے تو پھر بھی گو تجھ سے ہوا سرزد
نشے میں محبت کے ہر جرم بیہ کاراں
تپتے ہوئے ماتھے پر ہے مہر الو ہیت
دکھتے ہوئے سینے میں صد کرب و عذابِ جاں
ہے وقت کے چہرے کا غازہ ترا خونِ گرم
سوزِ دلِ انساں ہے جلوہ دہِ ہر عنواں
قطرے تیرے آنسو کے آئینۂ مستقبل
تقدیر بنی آدم ہے غم میں ترے پنہاں
ہے تیری بیہ مستی جو لانگہ برقِ عقل
ہے عقل میں بھی تیری انداز بلا نوشاں
گونجی ہوئی دنیا میں ہیں تیری ہی آوازیں
اے نغمہ سرائے جاں، اے طائرِ خوش الحاں
اے جانِ جہاں دنیا انوار کی دنیا ہے
ہر روز ہے زر افشاں، ہر شب ہے گہر ریزاں

ہر منظر فطرت کو ہے تجھ سے ہم آہنگی

یہ مجمع ہمدرداں، وہ محفل غم خوراں

ہاں مانگ لیا تو نے پھر بانٹ دیا تو نے

نفرت سے غم فطرت، انساں کو غم انساں

پایا ہے تجھے مضطر گہ سیج پہ پھولوں کی

گہ دار و رسن پر بھی پایا ہے تجھے خنداں

آزادی تری فطرت، ہر قید تری قسمت

آوارۂ ہر گلشن، شائستہ ہر زنداں

اس گلشنِ ہستی کا پر کیف ہے ہر منظر

پھولوں پہ نظر کر کے کانٹوں پہ نظر کر ہاں

نغموں میں ترے اے دل دیکھی ہے زمانے نے

تصویرِ غمِ دوراں، تاثیرِ غمِ جاناں

ہر چیز نشانہ ہے ہر تیر ترازو ہے

اس عالمِ ہستی کے اے فاتحِ عالیشاں

تیرا ہی تصرف ہے تیرا ہی تکلّف ہے

وہ بزم فریدوں ہو یا انجمنِ کیواں

رن بولتے ہیں اے دل یا تو ہی دھڑکتا ہے

ہیں تیری ہی زد میں سب کیا خیبر و کیا فاراں

دنیا میں ہوئے اے دل کتنے ہی مہا بھارت

ارجن کی کماں تھا تو، تو بھیشم کا تھا پیکاں

ہے کرشن کے گھنگھرو کی جھنکار ترے خوں میں

گیتی کی ہے رادھا کا ہاتھوں میں ترے داماں

جس بانسری کی لے پر مدھوبن کو بھی وجد آیا

تھا اس کے کبھی پردے میں ہاں تو ہی تو نغمہ خواں

اٹھی ہیں ترے غم میں تپ کر کئی تہذیبیں

تابندہ ترے خوں سے تاریخ کا ہر عنواں

اِن ملکوں کی تہذیبیں تیرے ہی کرشمے تھیں

ہو چین کہ ہندوستاں، وہ مصر ہو یا ایراں

ظلمات چکاں کبھی تو ، انوار فشاں کبھی تو

تو بانیٔ خیر و شر ، تو بیم و رجا کی جاں

بے وجہ نہیں تجھ کو ترجیح ملائک پر

ایک ایک ادا تیری تسخیر کُنِ یزداں

جبریل کی بھی ہمت چھٹ جائے جہاں اے دل

ایسی بھی فضاؤں میں پایا تجھے پرافشاں

قائم تری ہمت سے ہے نظمِ جہاں اے دل

بے تیرے بکھر جائے شیرازۂ جسم و جاں

ہے کارِ اہم تیرا تہذیب کو دل دینا

حاصل ہے تمدن کا تیرا عمل پنہاں

احسان گراں اے دل شاعر پہ بھی ہیں تیرے

ملتی یہ کہاں مجھ کو شائستگیٔ وجداں

جو غم کے دریچوں سے جنت میں پہنچتی ہیں

وہ ٹھنڈی ہوائیں بھی ہیں تیری نسیمِ جاں

یہ بزمِ جہاں تجھ سے اک بزمِ محبت ہے

اے عشق کے سوزِ جاں اے جلوہ دہِ خوباں

ابرو میں لچک تیری، تیور میں دمک تیری

تو حسنِ طرحداراں، تو نازشِ کج کلہاں

تیزیٔ سناں تیری، تخلیقِ بُتاں تیری

مطلوبِ جگرداراں، محبوبِ نظربازاں

کاشیٔ ازل ہے تو، روماۓ ابد ہے تو

تو کعبۂ دوراں ہے تو قبلۂ عالمیاں

دنیا میں نئے جگ کا وہ شہر بسایا ہے

صد رشکِ مدائن ہے جس شہر کا ہر ایواں

اس ہند کی مٹی سے تخلیق ہوئی تیری

قرنوں سے رہی ہے جو سیرابِ جوۓ حیواں

تجھ میں وہ گھلاوٹ ہے تجھ میں وہ حلاوت ہے

آب و گلِ جنت بھی اِس چاشنی کی خواہاں

غم میں ترے پلتا ہے انسان کا مستقبل

اہمیتِ غم تجھ کو معلوم نہیں ناداں

اک آیۂ رحمت ہے ہر خطِ خراشِ غم

ہر زخم کے ساتھ اُترا سینے میں نیا قرآں

دنیا میں تری اے دل، ہر روز ہے روزِ غم

دنیا میں تری اے دل، ہر رات شبِ ہجراں

خاموش فضا لیکن دیتی ہے بشارت بھی

پھر بزم سجائے گا تیرا یہ غمِ پنہاں

دشمن کو بھی کر لے گا اک روز وہ دوست اپنا

سائے سے بھی اپنے ہے گو آج بشر ترساں

مانا کہ ہے دنیا کا یہ دور بہت نازک

گو موت کے سائے ہیں بر روئے زمیں رقصاں

مایوس نہیں ہوتے، افسردہ نہیں ہوتے

ہر جرم و گنہ کر کے انسان ہے پھر انساں

تاریخ ہٹاتی ہے گر ایک قدم پیچھے
دو گام بڑھ آنے کا کرلیتی ہے یہ ساماں

کچھ دیر نہ آئے جو فطرت سے بوئے فطرت
کچھ دیر نہ آئے جو انساں سے بوئے انساں

تو اے دل غم دیدہ یہ دَور عبوری ہے
" خودغیریت " اس جُگ کا ہے اک اثر پنہاں

منسوخ بھی کرتی ہے تاریخ کچھ اپنے باب
اپنے لئے کرتی ہے قائم وہ نئے عنواں

اے دل یہ نئے عنواں بھی دین ہے تیری ہی
تیرے ہی تو اشک خوں ہوتے ہیں چمن افشاں

ہے باد خزاں میں بھی بو تازہ بہاروں کی
مٹتی ہے سیہ بختی ، کٹتی ہے شب ہجراں

بے نام سی اک کاوش تقدیر تری اے دل
از صبح ازل کوشاں تا شام ابد کوشاں

پانے کے لئے جس کو گردش میں ہیں پیارے

ہے تیرے ہی پردوں میں وہ رازِ غمِ دوراں

تیری یہ کہانی تو دنیا کی کہانی ہے

ہاں خود پہ نظر کر کے دنیا پہ نظر کرہاں

نغمۂ حقیقت

بے نمود اور نمودار کہیں دیکھا ہے؟ اس قدر سادہ و پُرکار کہیں دیکھا ہی؟

سوداؔ

بے حجابی یہ کہ ہر صورت میں جلوہ آشکار اُس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

آسیؔ غازیپوری

مرا رازِ نہاں ہرگز سمجھ میں آ نہیں سکتا
جہاں کی سرحدِ ادراک و اندازہ میں کب میں ہوں
سبب میرا پیمبر ہو کہ عارف پا نہیں سکتا
کہ ان سب کا سبب ہے ایک ہی اور وہ سبب میں ہوں

میں اِس دنیا کی ہر ہستی کا ہوں سرمایۂ ہستی
مری ہی ذات سے سب ہیں یہاں نشو و نما پاتے
میں ہوں اہلِ فلک اہلِ زمیں کی رفعتِ و پستی
جو آخر کار میری ذات میں ہیں محو ہو جاتے

جسے معلوم ہے میں لا سبب ہوں اور ناپیدا
مرے زیر نگیں جو سارے عالم کو سمجھتا ہے
کبھی اوہام باطل سے وہ دھوکا کھا نہیں سکتا
کہ داغِ معصیت سے اس کا دامن پاک ہوتا ہے

بصیرت، عقل، ہمدردی، صداقت اور خدا ترسی
شجاعت، خوف، ہستی نیستی، نیکی، ریا کاری
سکونِ قلب، دُکھ، سُکھ، نیکنامی اور بدنامی
مرے ہی نور کی کرنیں ہیں یہ کیفیتیں ساری

نرالا پن ہوں میں ہی دہر کی ہر فرد ہستی کا
دلِ ہر ذرّہ ناچیز میں سازِ انا الکل ہوں
ہوں میں ہی کفر میں اندازِ شانِ حق پرستی کا
کہ ہر بکھرے ہوئے شیرازے کا میں ہی تسلسل ہوں

مرکب میں ہوں میں ترکیب مفرد میں ہوں یکتائی
ہوں پستی کا سہارا اور بلندی کی میں رفعت ہوں
دل عاشق میں ہوں درد اور حسینوں میں ہوں رعنائی
میں یعنی دہر کی ہر اک حقیقت کی حقیقت ہوں

جنوں دیوانوں میں وحشت ہوں اچھی آنکھ والوں میں
ہوں دم خم خوش قدوں میں آن ہوں میں بجھلا ہوں میں
رخ رنگیں میں تابش، برہمی ہوں بکھرے بالوں میں
محبت میں ہوں بیباکی، حیا نیچی نگاہوں میں

میں ہوں وہ سمّ قاتل جس نے لاکھوں کو سُلا رکھا
حیاتِ خضر جس پر توڑ دے دم وہ زمیں میں ہوں
مرے کاٹے ہوؤں نے ہِل کے کبھی پانی نہیں مانگا
جو ڈس لے پل جھپکنے میں وہ مارِ آستیں میں ہوں

وہ بیزاری ہوں جو افسردہ خاطر حُسن کو کر دے
جو بیخود کر دے میں وہ بادۂ سرجوش ہستی ہوں
وہ برقِ حُسن ہوں رگ رگ میں جو چنگاریاں بھر دے
نئے سر سے جو لائے ہوش میں وہ کیفِ مستی ہوں

میں ہوں وہ ضبط جس میں اضطرابِ برق پنہاں ہے
وہ بیتابی ہوں جس کی ہر تڑپ ہے ضبط کی منزل
وہ ناکامی ہوں جو صد مقصدوں سے گل بداماں ہے
میں وہ مقصد ہوں جو مطلب براری کو نہیں حاصل

وہ آزادی ہوں زندانِ بلا میں جس کا مسکن ہے
میں ہوں وہ قید، ہیں آزادیاں طوقِ گلو جس کی
میں ہوں وہ یا دِ صرصر جس کے ہر جھونکے میں گلشن ہے
میں وہ پھولا چمن ہوں پا نہیں سکتے ہیں بو جس کی

تڑپ وہ ہوں سکونِ انتہائی جس میں پنہاں ہے
سکوں وہ ہوں میں جو افلاک کی گردش کا حامل ہے
وہ منزل ہوں جہاں کیفیتِ شامِ غریباں ہے
غُبارِ رہ گزر ہوں جس کے ہر ذرّے میں منزل ہے

سرِ شامِ جوانی روئے تاباں کی صباحت ہوں
میں ہر دُکھتے ہوئے دل میں جلن ہوں سوزِ پنہاں کی
شبستانِ جمالِ گیسوئے پُر خم کی زینت ہوں
لبِ جاں بخش میں مَیں ہی جھلک ہوں سحرِ لرزاں کی

وہ بیہوشی ہوں میں جو ہوش والوں کا پتہ رکھے
نہ جیتی جا سکی جو آج تک میں ہی وہ بازی ہوں
وہ عُریانی ہوں میں جو سارے رازوں کو چھپا رکھے
جو ٹھوکر دربدر کھائے وہ شانِ بے نیازی ہوں

ہے جس میں سر بسر وحدت کا عالم میں وہ کثرت ہوں
مری وحدت میں کروٹ لے رہی ہیں کثرتیں لاکھوں
سنبھل جاتے ہیں سب کے ہوش جس سے میں وہ وحشت ہوں
میں ہوں وہ ہوش جس میں جوش زن ہیں وحشتیں لاکھوں

ہوں وہ گم گشتگی ہر جستجو میں جو رہے پنہاں
میں ہوں وہ زندہ دل جس کی اُداسی کی نہیں حد ہے
میں ہوں وہ عقدۂ مشکل جو آساں تر سے ہو آساں
وہ دعویٰ ہوں میں جس میں سب دلیلوں کی چھپی رد ہے

جو کر دے شور عالم میں بپا وہ بے زبانی ہوں
وہ وحشی ہوں دمِ ہنگامۂ محشر جو سو جائے
اَنَا الحق بول اٹھے جو عشق کی وہ بدگمانی ہوں
وہ غافل ہوں سرِ دار آکے جس کی صبح ہو جائے

ہوں میں ہی صبر پانچوں پانڈوں کا دشت گردی میں
میں جانبازی ہوں جنگِ بدر میں سر کھونیوالوں کی

ہوں استقلال میں ہی رام کا صحرا نوردی میں
ہوں گہری نیند خاکِ کربلا میں سونیوالوں کی

غمِ الفت میں ہوں میں نا اُمیدی شامِ ہجراں کی
خرامِ ناز والوں کے دبے پاؤں کی آہٹ ہوں
میں ہر دُکھتے ہوئے دل میں چمک ہوں دردِ پنہاں کی
حسینوں کے لبوں پر چوٹ کھائی مسکراہٹ ہوں

محبت والوں میں افسانہ ہوں میں شامِ ہجراں کا
ہوں بے خبری سرِ شامِ جوانی سونے والوں کی
دلوں میں زخم ہوں میں ہی تبسم ہائے پنہاں کا
ہوں میں ہی بیخودی میں سر جھکا کے رونیوالوں کی

سرشکِ خوں میں ہیں رنگینیاں میری ہی جلووں کی
مری برقِ نظر چشم و چراغِ اہلِ محفل ہے
مرا خونِ تمنا ہے رگوں میں حسن والوں کی
رخِ رنگیں کا آئینہ مرا دکھتا ہوا دل ہے

میں ہوں مظلوم کی فریاد ظالم کی ستم کوشی
ہوں زرِ منعم کا مفلس کا غمِ فاقہ کشی میں ہوں
میں ہوں زاہد کا پرہیز اور رندوں کی بلانوشی
حلیموں میں ہوں حلم اور سرکشوں کی سرکشی میں ہوں

شفق میں ہوں میں سُرخیِ چشمِ انجم میں ہوں بیداری
شعاعِ مہرِ عالم تاب میں میں تھرتھراہٹ ہوں
میں ہوں پچھلے پہر میخانۂ عالم کی سرشاری
طلوعِ صبح میں میں ہی فضا کی کپکپاہٹ ہوں

وہ دردِ ہجر ہوں کیفِ وصالِ دوست ہے جس میں
میں ہوں وہ وصل بیتابی ہے جس میں کربِ ہجراں کی
دلِ افسردہ ہوں جو شمع بن جاتا ہے محفل میں
ہوں وہ اُمید میں ہی جان ہے جو یاس و حرماں کی

وہ سناٹا ہوں خوابیدہ ہیں جس میں لاکھوں آوازیں
وہ تاریکی ہوں جس میں سیکڑوں خورشید پنہاں ہیں
میں ہوں وہ صُلحِ کل چلتی ہیں جس میں لاکھوں تلواریں
وہ دلجمعی ہوں جس میں سیکڑوں خاطر پریشاں ہیں

وہ لب تشنہ ہوں جس کے حلق میں سیلاب جاری ہے
میں وہ دریا ہوں جس میں تشنہ لب لاکھوں تڑپتے ہیں
ہوں وہ جوشِ محبت میں جسے نفرت بھی پیاری ہے
ہوں وہ پیکارڈ نکے صلح کل کے جس میں بجتے ہیں

وہ بیداری ہوں دینا جس میں گہری نیند سوتی ہے
ہوں وہ خوابِ گراں بیدار جس میں رہتا ہے عالم
ہوں وہ دار المحن جس میں خوشی دن رات ہوتی ہے
ہوں وہ عشرت کدہ رہتا ہے جس میں روز و شب ماتم

میں ہوں وہ چاندنی یہ ماہ جس کا ایک پارا ہے
بقا جس کا فقط اک لمحہ ہے وہ عمرِ فانی ہوں
میں ہوں وہ دھوپ یہ خورشید جس کا اک شرارا ہے
سمندر لہر مارے جس میں وہ اک بوند پانی ہوں

وہ نقطہ ہوں ہزاروں شکلیں جس میں ہستی میں پنہاں
وہ ویرانہ ہوں آبادی جہاں دنیا کی بستی ہے
نوائے راز ہوں جس میں ہیں لاکھوں ساز کے ساماں
وہ محتاجی ہوں جس کو دولتِ دنیا ترستی ہے

ادا جس میں شناسائی کی ہے وہ کم نگاہی ہوں
اُٹھے بیگانہ وش جو وہ نگاہِ آشنا ہوں میں
جو آئے خوبیٔ قسمت کے ہاتھوں وہ تباہی ہوں
جہاں سوتی ہیں تقدیریں وہاں بخت آزما ہوں میں

میں ہوں وہ رازِ سربستہ رہے جو سر بسر عُریاں
شفا ہے ہر مرض کی جو وہ دردِ لا دوا میں ہوں
شکستِ فاش ہوں وہ جس میں ہیں فتح وظفر پنہاں
مچلتی ہے فنا کی گود میں جو وہ بقا میں ہوں

میں ایسی نیستی ہوں دردِ ہستی جس میں پنہاں ہے
جو سُرمہ چشمِ مہر و ماہ میں ہے میں وہ ظلمت ہوں
وہ دوزخ ہوں میں ہر شعلہ جہاں جنت بداماں ہے
رہے جو نارِ دوزخ در گریباں میں وہ جنت ہوں

اجل کا راز ہے جو وہ حیاتِ جاودانی ہوں
بندھے جو ٹوٹتے سے وہ طلسمِ رنگ و بو ہوں میں
جو چشمک زن بقا سے ہے میں وہ دنیائے فانی ہوں
جسے خود کھا گیا ہوں وہ فریبِ آرزو ہوں میں

نمودِ حسنِ دنیا ہے مری جاتی ہوئی دنیا
نگاہِ حسنِ عالم ہے نگاہِ واپسیں میری
یہ خلقت ہے مرے دردِ محبت کا چمک جانا
دو عالم کو مٹا کر رکھ دے اک چینِ جبیں میری

یہ نظمِ عالمِ ہستی مرے ہی دم سے قائم ہے
اُلٹ دوں میں زمیں کو ایک ابرو کے اشارے سے
تلاطم جس سے ہے ہر وقت برپا وہ مرا دم ہے
میں چاہوں تو سمندر دور ہٹ جائے کنارے سے

وہ اک لمحہ ہوں میں جس کا کبھی کٹنا نہیں ممکن
وہ دن ہوں آ کے جو شہرِ خموشاں کو جگا جائے
میں ایسا وقت ہوں جس کا کبھی گھٹنا نہیں ممکن
وہ شب ہوں میں ستاروں کو کبھی جس میں نیند آ جائے

غرض بزمِ جہاں میں حسن اور رونق ہے جو کچھ بھی
ظہور اُس کا یہاں اے دوست میری ہی بدولت ہے
مگر دنیا کی ہستی تو فقط اک شان ہے میری
بھلا وہ کب عیاں ہے جو مرا رازِ حقیقت ہے

ترانۂ عشق

ہندی کے ایک مشہور گیت سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی گئی۔ وہ
گیت یوں شروع ہوتا ہے

بلوا چمکے اجری مچھریا رن چمکے تروار
سیجوا میں چمکے مورے سیاں کی پگڑیا سیجیا پہ نیدی ہمار

اسی انداز میں یہ نظم کہی گئی ہے ——— فراقؔ

جلوۂ گُل کو بلبل بہت ہے شمع کو گریۂ شام
بادِ بہاری گُل کو بہت ہے مجھ کو تیرا نام

———

بجلی چمکے کالی گھٹا میں جام میں آتشِ سرد
چمکے راکھ جوگی کی جٹا میں مجھ میں تیرا درد

بل نہ چھٹے تیرے بالوں سے ۔۔۔ اور نَے سے فریاد
پَل بھر من نہ چھٹے کالوں سے ۔۔۔ مجھ سے تیری یاد

شاخ پہ شعلۂ گل کی لپک ہو ۔۔۔ چرخ پہ انجم و ماہ
دنیا پر سورج کی چمک ہو ۔۔۔ مجھ پر تیری نگاہ

ترانۂ خزاں

ایک بار ریل کے سفر میں اپنے مخلص دوست قاضی عدیل عباسی صاحب
کا ساتھ ہو گیا۔ انھوں نے ایک خاص دھن میں اقبال کا ترانہ
"از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز" سنایا۔ اس ترانے کی لے اور شیلی کی
انگریزی نظم "ODE TO THE WEST WIND" اس نظم کی محرک ہوئی ـــــ فراق

یک لخت بدلتی ہوئی عالم کا سماں چل
اک آگ لگاتی ہوئی لرزاں و تپاں چل
جاتی ہوئی دنیائے چمن کی نگراں چل
آتی ہوئی رنگینیوں سے جلوہ فشاں چل

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

غنچہ کو چمن میں جو چٹکنا ہو چٹک لے
جس رنگ کو گلشن میں چمکنا ہو چمک لے
گر حُسنِ گلستاں کو دمکنا ہو دمک لے
کچھ دن کمرِ بادِ بہاری بھی لچک لے
اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

بدمستیوں کا دَور گزر جائے گزر جائے
برگ و گل و سبزہ کا چڑھا نشّہ اتر جائے
یہ بزمِ چمن سوئے عدم خاک بسر جائے
شیرازۂ گلزار بکھر جائے بکھر جائے
اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

پھولوں کے چراغاں کو بجھا دے تو بجھا دے
آتے ہی گلستاں میں اک اندھیر مچا دے
ہر باغ کو اک نکہتِ برباد بنا دے
گلزار کا گلزار لُٹا دے تو لُٹا دے

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

اربابِ چمن کو کفنِ خاک اُڑھاتی
پالیدگی ہر ذرّہ میں آتی ہے چھپاتی
تو مرگِ نباتات ہے تو روحِ نباتی
یا جانِ نُمو موجِ فنا بن کے ہے آتی

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

پھولے ہوئے گلزار کو ویران کیا ہے
طاؤس کو اڑتی ہوئی ناگن نے ڈسا ہے
اک قہر ہے آفت ہے قیامت ہے بلا ہے
یا باغ میں لہرائی ہوئی برقِ فنا ہے

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

سوکھا جو چمن اور ہوئی شانِ گلستاں
کیا جانئے کیوں حسن بنا سوختہ ساماں
ہر ذرہ سے اب وسعتِ صحرا ہے نمایاں
عالم ہے بنا باغ کا یہ منظرِ ویراں

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

گو سو طرح آباد ہیں آباد وطن بھی
بہلاتے ہیں انسان کو اجڑے ہوئے بن بھی
بے کیف نہیں بے گل و بے برگ چمن بھی
ہے دیکھنے کی چیز یہ عشرِ یانیٔ تن بھی

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

ویرانیوں سے خطۂ گلزار کر آباد
آبادیوں سے عرصۂ گلزار کر آزاد
آئے نظر اک عالمِ ہُو، ہر دلِ ناشاد
یہ کہنے لگے "اب گل و گلزار نہیں یاد"

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

ہر نکہت و ہر رنگِ گلستاں کو مٹا دے
ہر تفرقہ ہر طرح کی تمیز اٹھا دے
گلزار کو ہر قیدِ تعیّن سے چھڑا دے
اک جلوۂ بے کیف گلستاں کو بنا دے

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

پھولوں کو بھرا جام شہادت کا پلا دے
سرمستیِ گلزار کو تو کیفِ فنا دے
"ہے موت حسیں" راز یہ دُنیا کو بتا دے
رنگِ چمنستانِ خزاں دیدہ دکھا دے

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

جاں دادۂ ہستیٔ پریشانِ چمن تو
تنہا دمِ تنہائیٔ نگہبانِ چمن تو
خلوت کدۂ راز ہیں مہمانِ چمن تو
خمیازہ کشِ بادۂ عرفانِ چمن تو

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

تو رہ زنِ سرمایہ و سامانِ گلستاں
تو رہبرِ سر منزلِ عرفانِ گلستاں
از سمتِ عدم سلسلہ جنبانِ گلستاں
جانِ دگر قالبِ بے جانِ گلستاں

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

ویران چمن میں بھی ہے اک شانِ نزاکت
اک معنویت اس میں ہے، اک شانِ لطافت
اک رنگ کثافت ہے گل و لالہ کی کثرت
تو آ! کہ گلستاں بنے آئینہ وحدت
اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

جلوے ہیں سمائے ہوئے ویران فضا میں
ہیں راز لبائے ہوئے سنسان فضا میں
ہر آن نئی ہوتی ہے اک شان فضا میں
اک جان سی پڑ جاتی ہے ہر آن فضا میں
اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

یہ فصل خزاں موت کا افسانہ سنا جائے
ہر برگِ چمن زار پر اک نشہ سا چھا جائے
ہر پھول کو خوابِ عدم آباد دکھا جائے
جاگے ہوئے گلزار کو اک نیند سی آ جائے

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

تو ہے وہ ہوا شعلۂ گل کو جو بجھا دے
وہ آگ ہے جو باغِ تر و تازہ جلا دے
ہر نقش کے ہر رنگ کے آثار مٹا دے
گلزار کو تو دامنِ خنجر کی ہوا دے

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

جھونکے وہ چلیں غنچۂ سربستہ بکس جائے
سوسن کی زباں قطرۂ شبنم کو ترس جائے
ہاں بوئے کفن پیرہنِ باغ میں بس جائے
گلزار میں ہر چار طرف آگ برس جائے
اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

ہر ذرّے میں رکھ دی ہے جو اک آتشِ پنہاں
بھڑکے گی وہی بن کے گل و لالہ و ریحاں
اے مرگِ مفاجاتِ چمن، جانِ گلستاں
ہیں کتنی بہاریں تری شرمندۂ احساں
اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

آتے ہوئے گلزار کا گلزار لٹا دے
جاتے ہوئے گلزار کا گلزار کِھلا دے
تو ہستی گلزار عدم کر کے دکھا دے
پھر اس عدم آباد کو گلزار بنا دے

اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل

اے بادِ خزاں چل

شامِ عبادت

اگست ۱۹۴۳ء

سول اسپتال الٰہ آباد میں بسترِ علالت سے

(۱)

یہ کون مُسکراہٹوں کا کارواں لئے ہوئے
شباب شعر و رنگ و نور کا دُھواں لئے ہوئے

دُھواں کہ برقِ حسن کا مہکتا شعلہ ہے کوئی
چٹیلی زندگی کی شادمانیاں لئے ہوئے

لبوں سے پنکھڑی گلاب کی حیات مانگے ہے
کنول سی آنکھ سو نگاہِ مہرباں لئے ہوئے

قدم قدم پہ دے اٹھی ہے لَو زمینِ رہ گزر
ادا ادا میں بے شمار بجلیاں لئے ہوئے

نکلتے بیٹھتے دلوں کی آہٹیں نگاہ میں
رسیلے ہونٹ فصلِ گل کی داستاں لئے ہوئے

خطوطِ رخ میں جلوہ گر وفا کے نقش سر بسر
دلِ غنی میں کل "حسابِ دوستاں" لئے ہوئے

وہ مسکراتی آنکھیں جن میں رقص کرتی ہے بہار
شفق کی، گل کی، بجلیوں کی شوخیاں لئے ہوئے

ادائے حسن برق پاش، شعلہ زن، نظارہ سوز
فضائے حسن اُودی اُودی بجلیاں لئے ہوئے

جگانے والے نغمۂ سحر لبوں پہ موج زن
نگاہیں نیند لانے والی لوریاں لئے ہوئے

وہ نرگسِ سیاہ، نیم باز، میکدہ بدوش
ہزار مست راتوں کی جوانیاں لئے ہوئے

تغافل و خمار اور بے خودی کے اوٹ میں
نگاہیں اک جہاں کی ہوشیاریاں لئے ہوئے

ہری بھری رگوں میں وہ چہکتا بولتا لہو
وہ سوچتا ہوا بدن خود اک جہاں لئے ہوئے [۱]

زفرق تا قدم تمام چہرہ جسم نازنیں
لطیف جگمگاہٹوں کا کارواں لئے ہوئے

"تبسّمش تکلمے، تکلمش ترنّمے"
نفس نفس میں تھرتھراتا سازِ جاں لئے ہوئے

جبینِ نور جس پہ پڑ رہی ہے نرم چھوٹ سی
خود اپنی جگمگاہٹوں کی کہکشاں لئے ہوئے

"ستارہ بار و مہ چکاں و خور فشاں" جمالِ یار
جہانِ نور کارواں بہ کارواں لئے ہوئے

وہ زلف خم بہ خم شمیم مست سے دُھواں دُھواں
وہ رُخ چمن چمن بہارِ جاوداں لئے ہوئے

[۱] HER PURE AND ELOQUENT BLOOD SPOKE IN HER CHEEKS,
AND SO DISTINCTLY WROUGHT THAT ONE MIGHT SAY,
HER BODY THOUGHT (JOHN DONNE)

یہ مستیٔ جمال کائنات، خوابِ کائنات
یہ گردشِ نگاہ دورِ آسماں لئے ہوئے

یہ کون آگیا مرے قریب عضو عضو میں
جوانیاں، جوانیوں کی آندھیاں لئے ہوئے

یہ کون آنکھ پڑ رہی ہے مجھ پر اتنے پیار سے
وہ بھُولی سی وہ یاد سی کہانیاں لئے ہوئے

یہ کِسکی مہکی مہکی سانسیں تازہ کر گئیں دماغ
شبوں کے راز، نورِ مہ کی نرمیاں لئے ہوئے

یہ کن نگاہوں نے مرے گلے میں باہیں ڈال دیں
جہان بھر کے دُکھ سے درد سے اماں لئے ہوئے

نگاہِ یار دے گئی مجھے سکونِ بے کراں
وہ بے کہی وفاؤں کی گواہیاں لئے ہوئے

مجھے جگا رہا ہے موت کی غنودگی سے کون
نگاہوں میں سہاگ رات کا سماں لئے ہوئے

مری فسردہ اور بجھی ہوئی جبیں کو چھو لیا
یہ کس نگاہ کی کرن نے سازِ جاں لئے ہوئے

ستے ہے چہرے پر حیات رسمسائی مسکرائی
نہ جانے کب کے آنسوؤں کی داستاں لئے ہوئے

تبسمِ سحر ہے اسپتال کی اُداس شام
یہ کون آگیا نشاطِ بے کراں لئے ہوئے

ترے نہ آنے تک اگرچہ مہرباں تھا اک جہاں
میں رو کے رہ گیا ہوں سو غمِ نہاں لئے ہوئے

زمین مسکرا اٹھی ، یہ شام جگمگا اٹھی
بہار لہلہا اٹھی شمیمِ جاں لئے ہوئے

فضائے اسپتال ہے کہ رنگ و بو کی کروٹیں
ترے جمالِ لالہ گوں کی داستاں لئے ہوئے

فراقؔ آج پچھلی رات کیوں نہ مر رہوں کہ اب
حیات ایسی شامیں ہوگی پھر کہاں لئے ہوئے

(۲)

مگر نہیں کچھ اور مصلحت تھی اُس کے آنے میں
جمالِ و دیدِ یار تھے نیا جہاں لئے ہوئے

اسی نئے جہاں میں آدمی بنیں گے آدمی
جبیں پہ شاہکارِ دہر کا نشاں لئے ہوئے

اسی نئے جہاں میں آدمی بنیں گے دیوتا
طہارتوں کا فرقِ پاک پر نشاں لئے ہوئے

خدائی آدمی کی ہوگی اس نئے جہان پر
ستاروں کے ہیں دل یہ پیش گوئیاں لئے ہوئے

سلگتے دل شرر فشاں و شعلہ بار، برق پاش
گزرتے دن حیاتِ نو کی سُرخیاں لئے ہوئے

تمام قول اور قسم نگاہِ نازِ یار تھی
طلوعِ زندگیِ نو کی داستاں لئے ہوئے

نیا جنم ہوا میرا کہ زندگی نئی ملی
جیوں گا شام دید کی نشانیاں لئے ہوئے

نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کے عہد نو کے پردہ داروں نے
گزر گیا زمانہ یادِ رفتگاں لئے ہوئے

ہم انقلابیوں نے یہ جہاں بچا لیا، مگر
ابھی ہے اک جہاں وہ بدگمانیاں لئے ہوئے

(۳)

نئے زمانے میں اگر اُداس خود کو پاؤں گا
یہ شام یاد کرکے اپنے غم کو بھول جاؤں گا

عیادتِ حبیب سے وہ آج زندگی ملی
خوشی بھی چونک اٹھی تو غم کی آنکھ کھل گئی

اگرچہ ڈاکٹر نے مجھ کو موت سے بچا لیا
پر اُس کے بعد اُس نگاہ نے مجھے جلا لیا

نگاہِ یار تجھ سے اپنی منزلیں میں پاؤں گا
تجھے جو بھول جاؤں گا تو راہ بھول جاؤں گا

(۴)

قریب تریں ہو چلا ہوں دُکھ کی کائنات سے
میں اجنبی نہیں رہا حیات سے ممات سے
وہ دُکھ سہے کہ مجھ پہ کھل گیا ہے دردِ کائنات
ہے اپنے آنسوؤں سے مجھ پہ آئینہ غمِ حیات
یہ بے قصور جاندار درد جھیلتے ہوئے
یہ خاک و خوں کے پُتلے اپنی جاں پہ کھیلتے ہوئے
وہ زیست کی کراہ جس سے بیقرار ہے فضا
وہ زندگی کی آہ جس سے کانپ اٹھتی ہے فضا
کفن ہے آنسوؤں کا دُکھ کی ماری کائنات پر
حیات کیا، انھیں حقیقتوں سے ہونا بے خبر[۱]

۱ THE SENSE OF TEARS IN THINGS HUMAN "VIRGIL"

٥

جو آنکھ جاگتی رہی ہے آدمی کی موت پر
وہ ابرِ رنگ رنگ کو بھی دیکھتی ہے سادہ تر[ل]

سکھا گیا ہے دُکھ مرا پرائی پیر جاننا
نگاہ یار تھی یہاں بھی آج میری رہنما

یہی نہیں کہ مجھ کو آج زندگی نئی ملی
حقیقتِ حیات مجھ پہ سو طرح سے کھل گئی

گواہ ہے یہ شام اور نگاہِ یار ہے گواہ
خیالِ موت کو میں اپنے دل میں اب نہ دونگا راہ

جیوں گا ہاں جیوں گا اے نگاہِ آشنائے یار
سدا سہاگ زندگی ہے اور جہاں سدا بہار

ل THE CLOUDS THAT GATHER ROUND THE SETTING SUN DO TAKE A SOBER COLOURING FROM AN EYE THAT HATH KEPT WATCH O'ER MAN'S MORTALITY "WORDSWORTH"

(۵)

ابھی تو کتنے ناشنیدہ نغمۂ حیات ہیں
ابھی نہاں دلوں سے کتنے رازِ کائنات ہیں

ابھی تو زندگی کے ناچشیدہ رس ہیں سیکڑوں
ابھی تو ہاتھ میں ہم اہلِ غم کے جس ہیں سیکڑوں

ابھی وہ لے رہی ہیں میری شاعری میں کروٹیں
ابھی چمکنے والی ہیں چھپی ہوئی حقیقتیں

ابھی تو بحر و بر پہ سو رہی ہیں میری وہ صدائیں
سمیٹ لوں اگر تو پھر وہ کائنات کو جگائیں

ابھی تو روح بن کے ذرے ذرے میں سماؤں گا
ابھی تو صبح بن کے میں اُفق پہ تھرتھراؤں گا

ابھی تو میری شاعری حقیقتیں لُٹائے گی
ابھی مری صدائے درد اک جہاں پہ چھائے گی

ابھی تو آدمی اسیرِ دام ہے غلام ہے
ابھی تو زندگی صدا انقلاب کا پیام ہے

ابھی تمام زخم و داغ ہے تمدنِ جہاں
ابھی رخِ بشر پہ ہیں بہیمیت کی جھائیاں

ابھی مشیتوں پہ فتح پا نہیں سکا بشر
ابھی مقدروں کو بس میں لا نہیں سکا بشر

ابھی تو اس دکھی جہاں میں موت ہی کا دور ہے
ابھی تو جس کو زندگی کہیں وہ چیز اور ہے

ابھی تو خون تھوکتی ہے زندگی بہاریں
ابھی تو رونے کی صدا ہے نغمہ ستاریں

ابھی تو اڑتی ہیں رخِ بہار پر ہوائیاں
ابھی تو دیدنی ہیں ہر چمن کی بے فضائیاں

ابھی فضائے دہر لے گی کروٹوں پہ کروٹیں
ابھی تو سوتی ہیں ہواؤں کی وہ سنسناہٹیں

کہ جن کو سنتے ہی حکومتوں کے رنگ رُخ اڑیں
چپٹیں جن کی سرکشوں کی گردنیں مروڑ دیں

ابھی تو سینۂ بشر میں سوتے ہیں وہ زلزلے
کہ جن کے جاگتے ہی موت کا بھی دل دہل اٹھے

ابھی تو بطنِ غیب میں ہے اس سوال کا جواب
خدائے خیر و شر بھی لا نہیں سکا تھا جس کی تاب

ابھی تو گود میں ہیں دیوتاؤں کی وہ ماہ و سال
جو دیں گے بڑھ کے برقِ طور سے حیات کو جلال

ابھی رگِ جہاں میں زندگی مچلنے والی ہے
ابھی حیات کی نئی شراب ڈھلنے والی ہے

ابھی چھری ستم کی ڈوب کر اُچھلنے والی ہے
ابھی تو حسرت اک جہان کی نکلنے والی ہے

ابھی تو گھن گرج سنائی دے گی انقلاب کی
ابھی تو گوش برصدا ہے بزمِ آفتاب کی[1]

[1] بزمِ آفتاب یعنی نظامِ شمسی

ابھی تو پونجی واد[1] کو جہان سے مٹانا ہے
ابھی تو سامراجوں کو سزائے موت پانا ہے
ابھی تو دانت پیستی ہے موت شہریاروں کی
ابھی تو خوں اتر رہا ہے آنکھوں میں ستاروں کی
ابھی تو اشتراکیت کے جھنڈے گڑنے والے ہیں
ابھی تو جڑ سے کشت وخوں کے نظم اکھڑنے والے ہیں
ابھی کسان و کامگار راج[2] ہونے والا ہے
ابھی بہت جہاں میں کام کاج ہونے والا ہے
مگر ابھی تو زندگی مصیبتوں کا نام ہے
ابھی تو نیند موت کی مرے لئے حرام ہے

یہ سب پیام اک نگاہ میں وہ آنکھ دے گئی
بیک نظر کہاں کہاں مجھے وہ آنکھ لے گئی

[1] پونجی واد ۔ سرمایہ داری ، سامراج و شہنشاہیت یا ملوکیت

[2] کسانوں اور مزدوروں کا راج

حسن کی دیوی سے

یہ رنگ رنگ جوانی چمن چمن پیکر
یہ غنچہ غنچہ تبسم، قدح قدح گفتار

نگاہ پھول، لبِ ناز، شعلۂ عینی
شباب میکدہ بردوش وگلستاں بکنار

یہ ہے صدا کی کھنک یا ترنمِ سحری
یہ گام گام چراغاں یہ گرمیٔ رفتار

جماہی لیتے ہوئے بھی پیالہ زن ہر عضو
تمام نشہ زسرتا قدم تمام خمار

بردں میں آئینہ در آئینہ بہارِ جناں
رگوں میں راگنیوں کی ملی جلی جھنکار

تناؤ مدبھرے سینے کا یہ کمر کا کٹاؤ
خطوطِ جسم سرنگی کے ہیں کھنچے ہوئے تار

ان انکھڑیوں میں جلیں جرم اولیں کے چراغ
لپک گناہ کے شعلوں کی ابروِ خمدار

یہ سب سہی مگر اللہ رے یہ معصومی
گنہ کو بھی کریں پاکیزہ حسن کے اطوار

یہ انگ انگ میں رس جس کی نظر نظر میں دعائیں
یہ بات بات میں امرت کی ہلکی ہلکی پھوار

فرازِ سینہ پہ رخشندہ دو مہِ کامل
وہ جسم چاندنی میں جیسے چھوٹتا ہوا انار

قدِ جمیل ہے یا کامدیو کی ہے کماں — نظر کے پھول گندھے تیر کھیتے جاتے ہیں وار

کھِلا کھِلا شگفتانِ صبحِ پیکرِ ناز — یہ تہہ بہ تہہ موئے زلف سیاہ ابرِ بہار

خمِ ذقن ہے کہ ترشا ہوا کوئی کوندا — ازل کے کھلتے ہوئے گلستاں گُلِ رخسار

افق سے کنپٹیوں کے پویں سی پھٹتی ہوئی — دمکتی لوحِ جبیں صاف مطلعِ انوار

سڈول پن ہے غضب ساعدِ بلوریں میں — کہ ڈھل کے سانچے میں شعلے کو جیسے آئے قرار

لقارِ ناز پہ پرچھائیاں سی پڑتی ہوئی — زہے یہ جلوؤں کی تجدید صورتِ تکرار

ہر ایک عضو ہے آئینۂ رخِ یزداں — بدن ہے شیشہ گرانِ غیاب کا شہکار

خرامِ ناز وہ اونچی کرے جو سطحِ حیات — نگاہِ ناز بڑھائے جو زندگی کا وقار

یہ چہرہ صبحِ بنارس یہ زلف شامِ اودھ — کمندِ پیکرِ نازک فضائے خلد شکار

ز فرق تا بقدم یہ تناسبِ اعضا — کہ بت تراشی یونان و پارس و ہند نثار

لطافتِ قدِ رعنا ریاضتِ تخلیق — صفائے عارضِ تر زندگی کی آئینہ دار

دہیں وہ کھا کے پچھاڑیں چمن میں توڑے دم — بدن کے لوچ کو دیکھے اگر نسیمِ بہار

نظر کے سامنے ہے حسن آنکھ اوجھل بھی — تمام لذتِ دیدار و حسرتِ دیدار

جو سن سکے کوئی ہر عضو بات کرتا ہے — نظر نظر ہے تکلم ادا ادا گفتار

ان انگلیوں کے اشاروں سے جل اُٹھے ہیں کنول — ہے عشوہ عشوہ ضیا پاش ادا ادا گلبار

گواہِ دیدۂ مشتاق چہرہ ہے ہر عضو — جہاں سے دیکھیے پیکر تمام روئے نگار

کشش ہے حسن کی یا مرجع ہجوم نگاہ — ہر انگ عرصۂ تنگست و مرد ماں بسیار

شباب رنگ پہ ہے بولتا ہے طوطی ناز — صدا پھڑکتی رگوں میں لہو کی یہ چہکار

بدن میں سر سے قدم تک چٹکتی ہیں کلیاں — زہے تبسم ہر عضو رشکِ صبحِ بہار

نزاکتِ خطِ گردن سنہری حلقۂ نور — لطافتِ تنِ رعنا فنون کا معیار

نہ آئینے کی ضرورت نہ چشم حیراں کی — بجائے خود تنِ رنگیں ہی جنت دیدار

بسی کرن ہے وہ آنکھوں میں جسکی تاب نہ لائیں — فرشتے عشق سے جنکو نہیں ذرا انکار

جمال ہے کہ مجسم کھنچی ہوئی اک الاپ — نشان نغمہ[1] ہے ایک ایک خط جسمِ نگار

ہلا بلا کے کبھی جس کو کوئی نہ جان سکا — نگاہ ناز ڈنانوسِ عالم اسرار

نگاہِ شوخ میں صدہا مطالبِ رنگیں — سکوت ناز میں صدہا معانیِ تہہ دار

خدا کبھی سوچے جو شکلوں کی اصطلاحوں میں — یہی نقوش بدن ہوں گے سرمدی افکار

خیال کے کبھی تو لفظوں میں عرض طول نہیں — انھیں کے ملنے سے پیدا ہوا یہ جسمِ نگار

[1] نشان نغمہ یعنی MUSICAL NOTATION

شبِ وصال کٹے پھر بھی یہ کنوارا پن تمام غنچہ صفت ہے کھلا ہوا گلزار

یہ بیخودیِ نظر یہ فسوں کاریِ حسن یہ خوابناکیِ جلوہ یہ جادوِ بیدار

صدائے ناز میں جیسے چمک تاروں کی وہ بات کرنے میں آواز کا چڑھاؤ اُتار

کنار میں بھی اسے لے کے ڈھونڈھتے رہئے سپردگی کے بھی پہلو میں صد ادائے فرار

فضائیں چونک اٹھیں اس کی جنبشِ لب پر پیامِ سرسریِ حسن زندگی کی پکار

پیام وحدتِ انسانیت وہ آنکھوں میں کہ کفر و دین بھلا بیٹھے کافر و دیندار

یہ دیدِ حسن کے لمحے برس برس کے ہیں دن منائے جائیں بیک وقت جیسے کل تہوار

ہر اک نگاہ میں اندیشہ ہائے دور و دراز چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار

میانِ دارِ فنا حسن کے تصور کا ہے نیم لمحہ بھی اک وقفۂ بقا آثار

وہی ہے حسن جو تاریخ کو معانی دے وہی ہے عشق جو بن جائے زیورِ کردار

اسی کے زیرِ مژہ پل رہی ہیں تہذیبیں ردائے نازِ تمدن کی ہے علم بردار

جو دستِ ناز چھوئے مرد کی جبینِ غمیں کرے وہ ہر شکنِ کربِ زندگی ہموار

کریں نہ عظمتِ عورت کا ان سے اندازہ تمام علم و عمل اس کی مامتا پہ نثار

وہی تو معنیٔ معراج ہے جو قدموں پہ جھکائے سر کو تو اونچا ہو مرد کا پندار

خدا گواہ کہ عورت ہے ملکۂ آفاق — یہ مہر و ماہ کواکب سب اُسکے باج گزار

اسی کو ہم تو خدا کی سنوار کہتے ہیں — وہ دلنواز ادا سے نظر کی اک جھنکار

جبیں سے تا کف پا روپ یوسفستاں ہے — وہ چہرے آئے نظر جسم ہے کہ شہر نگار

جمال پلٹا رہا ہے شعور یزداں میں — نصیبِ عشق کہ صورت پکڑ گئے افکار

ڈرا ڈرا سا ہوں میں اپنی خوش نصیبی پر — کہ اُس کو چھین نہ لے مجھ سے گنبدِ دوّار

سناؤں کیا میں ندیم اپنی داستانِ حیات — کہ شرحِ دوزخ و جنّت ہے ہے میں لیل و نہار

فراقؔ ہم تو کہیں گے حیات پر ایماں
ابھی جو لا نہ سکے اس کو دیکھ لیں اک بار

ہنڈولہ

دیارِ ہند تھا گہوارہ ——— یاد ہے ہمدم؟
بہت زمانہ ہوا ——— کس کے کس کے بچپن کا
اسی زمین پہ کھیلا ہے رامؔ کا بچپن
اسی زمین پہ اُن ننھے ننھے ہاتھوں نے
کسی سمے میں دھنش بان کو سنبھالا تھا
اسی دیار نے دیکھی ہے کرشن کی لیلا
یہیں گھروندوں میں سیتا، سلوچنا، رادھا
کسی زمانے میں گڑیوں سے کھیلتی ہوں گی
یہی زمیں، یہی دریا، پہاڑ، جنگل، باغ
یہی ہوائیں، یہی صبح و شام، سورج، چاند

یہی گھٹائیں، یہی برق و رعد و قوس و قزح
یہیں کے گیت، روایات، موسموں کے جلوس
ہوا زمانہ کہ سدھارتھ کے تھے گھوارے
انہی میں آنکھ کھلی تھی اشوک اعظم کی
انہی نظاروں میں بچپن کٹا تھا وکرم کا
سنا ہے بھرتری بھی انہیں سے کھیلا تھا
بھرت[1]، اگست، کپل، ویاس، پاشی، کوٹلیہ
جنک وششت، منو، والمیک، وشوامتر
کناد، گوتم ورا ما-انج، کمارل بھٹ
مہنجو ڈارو، ہڑپا کے اور اجنتا کے
بنانے والے یہیں بلموں سے کھیلے تھے
اسی ہنڈولے میں بھوبھوت و کالیداس کبھی
ہمک ہمک کے جو تتلا کے گنگنائے تھے

[1] شکنتلا کا بیٹا جس کے نام کی رعایت سے یہ ملک بھارت کہلایا فراق

سرسوتی نے زبانوں کو ان کی چوما تھا
یہیں کے چاند و سورج[1] کھلونے تھے اُن کے
انہی فضاؤں میں بچپن پلا تھا خرد کا
اسی زمیں سے اُٹھے تان سین اور اکبر
رحیم، و نانک و چیتنیہ اور چشتی نے
انہی فضاؤں میں بچپن کے دن گزارے تھے
اسی زمیں پہ کبھی شاہزادۂ خرم
ذرا سی دل شکنی پر جو رو دیا ہو گا
بھر آیا تھا دل نازک تو کیا عجب اُس نے
ان آنسوؤں میں جھلک تاج کی کبھی دیکھی ہو
اہلیا بائی، دمن، پدمنی و رضیہ نے
یہیں کے پیڑوں کی شاخوں میں ڈالے تھے جھولے
اسی فضا میں بڑھائی تھی پینگ بچپن کی

[1] میں سلیقہ کے ساتھ ہندی الفاظ کے درمیان عطف لانا جائز رکھتا ہوں۔ فراق

اہنی نظاروں میں ساون کے گیت گائے تھے
اسی زمین پہ گھٹنوں کے بل چلے ہوں گے
ملک محمد ورس کھان اور تلسی داس
اہنی فضاؤں میں گونجی تھی توتلی بولی
کبیر داس، ٹکا رام، سور ومیرا کی
اسی ہنڈولے میں ودیاپتی کا کنٹھ کھلا
اسی زمین کے تھے لال میر وغالب بھی
ٹھمک ٹھمک کے چلے تھے گھروں کے آنگن میں
انیس وحالی واقبال اور وارث شاہ
یہیں کی خاک سے ابھرے تھے پریم چند و ٹیگور
یہیں سے اٹھے تھے تہذیب ہند کے معمار
اسی زمین نے دیکھا تھا بال پن ان کا
یہیں دکھائی تھیں ان سب نے بال لیلائیں
یہیں ہر ایک کے بچپن نے تربیت پائی

یہیں ہر ایک کے جیون کا بال کانڈ کھلا
یہیں سے اٹھتے بگولوں کے ساتھ دوڑے ہیں
یہیں کی مست گھٹاؤں کے ساتھ جھومے ہیں
یہیں کی مدھ بھری برسات میں نہائے ہیں
لپٹ کے کیچڑ و پانی سے بچپنے اُن کے
اسی زمین سے اُٹھے وہ دیش کے ساونت
اڑا دیا تھا جنھیں کمپنی نے توپوں سے
اسی زمین سے اٹھی ہیں اَن گنت نسلیں
پلے ہیں ہند ہنڈولے میں اَن گنت بچے
مجھ ایسے کتنے ہی گمنام بچے کھیلے ہیں
مجھ ایسے کتنے ہی گمنام مرد وزن اٹھے
اسی زمیں سے اسی میں سپردِ خاک ہوئے
زمین ہند اب آرام گاہ ہے ان کی
اس ارضِ پاک سے اٹھیں بہت سی تہذیبیں

یہیں طلوع ہوئیں اور یہیں غروب ہوئیں

اسی زمین سے اُبھرے کئی علوم وفنون

فرازِ کوہ ہمالہ ، یہ رودِ گنگ وجمن

اور ان کی گود میں پروردہ کاروانوں نے

یہیں رموزِ خرام سکوں نما سیکھے

نسیم صبح تمدن نے بھیروین چھیڑی

یہیں وطن کے ترانوں کی وہ پویں پھوٹیں

وہ بے قرارِ سکوں زا ، ترنم سحری

وہ کپکپاتے ہوئے سوز و ساز کے شعلے

انہی فضاؤں میں انگڑائیاں جو لے کے اٹھے

لوؤں سے جن کے چراغاں ہوئی تھی بزمِ حیات

جنھوں نے ہند کی تہذیب کو ـــــ زمانہ ہوا

بہت سے زاویوں سے آئینہ دکھایا تھا

اسی زمیں پہ ڈھلی ہے مری حیات کی شام

اسی زمین پہ وہ صبح مسکرائی ہے
تمام شعلہ و شبنم ، مری حیات کی صبح
سناؤں آج کہانی میں اپنے بچپن کی
دل و دماغ کی کلیاں ابھی نہ چٹکی تھیں

ہمیشہ کھیلتا رہتا ننھا بھائی بہنوں میں
ہمارے ساتھ محلے کی لڑکیاں لڑکے
مچائے رکھتے تھے بالک اُدھم ہر ایک گھڑی
ہو ترنگ، اچھل پھاند کا یہ عالم تھا
محلہ سر پہ اٹھائے پھرے جدھر گزرے
ہمارے چہچہے اور شور گونجتے رہتے
چہار سمت محلے کے گوشے گوشے میں
فضائیں آج بھی لاریب گونجتے ہوں گے[1]
اگرچہ دوسرے بچوں کی طرح تھائیں بھی

[1] آواز کبھی فنا نہیں ہوتی۔ فراق

بظاہر اوروں کے بچپن سا تھا مرا بچپن
یہ سب ہی مرے بچپن کی شخصیت بھی تھی ایک
وہ شخصیت کہ بہت شوخ جس کے تھے خد و خال
ادا ادا میں کوئی شانِ انفرادی تھی
غرض کچھ اور ہی پچھن تھے میرے بچپن کے
مجھے تھا چھوٹے بڑوں سے بہت شدید لگاؤ
ہر ایک پر میں چھڑکتا تھا اپنی ننھی سی جاں
دل امنڈا آتا تھا ایسا کہ جی یہ چاہتا تھا
اُٹھا کے رکھ لوں کلیجے میں اپنی دنیا کو
مجھے ہے یاد ابھی تک کہ کھیل کود میں بھی
کچھ ایسے وقفے پر اسرار آ ہی جاتے تھے
کہ جن میں سوچنے لگتا تھا کچھ مرا بچپن
کئی معانیٔ بے لفظ چھونے لگتے تھے
بطونِ غیب سے میرے شعورِ اصغر کو

ہر ایک منظر مانوس، گھر کا ہر گوشہ
کسی طرح کی ہو گھر میں سجی ہوئی ہر چیز
مرے محلے کی گلیاں، مکاں درو دیوار
چبوترے، کنوئیں کچھ پیڑ، جھاڑیاں بیلیں
وہ پھیری والے کئی ان کے بھانت بھانت کے بول
وہ جانے بوجھے مناظر، وہ آسماں و زمیں
بدلتے وقت کا آئینہ گرمی و خنکی
غروب مہر میں رنگوں کا جاگتا جادو
شفق کے شیش محل میں گداز پنہاں سے
جواہروں کی چٹانیں سی کچھ پگھلتی ہوئی
شجر حجر کی وہ کچھ سوچتی ہوئی دنیا
سہانی رات کی مانوس رمزیت کا فسوں
علی الصباح افق کی وہ تھرتھراتی بھوئیں
کسی کا جھانکنا آہستہ پھوٹتی لو سے

وہ دوپہر کا سمے درجۂ تپش کا چڑھاؤ
تھکی تھکی سی فضا میں وہ زندگی کا اُتار
ہوا کی بنسیاں بنسواڑیوں میں بجتی ہوئی
وہ دن کے بڑھتے ہوئے سائے سہ پہر کا سکوں
سکوت شام کا جب دونوں وقت ملتے ہیں
غرض جھلکتے ہوئے سرسری مناظر پر
مجھے گمان پرستانیت کا ہوتا تھا
ہر ایک چیز کی وہ خواب ناک اصلیت
مرے شعور کی چلمن سے جھانکتا تھا کوئی
لئے ربوبیّتِ کائنات کا احساس
ہر ایک جلوے میں غیب و شہود کا وہ ملاپ
ہر اک نظارہ اک آئینہ خانۂ حیرت
ہر ایک منظرِ مانوس ایک حیرت زار
کہیں رہوں کہیں کھیلوں کہیں پڑھوں لکھوں

مرے شعور پہ منڈلاتے تھے مناظرِ دہر
میں اکثر ان کے تصور میں ڈوب جاتا تھا
وفور جذبہ سے ہو جاتی تھی مژہ پرنم

مجھے یقیں ہے ان عنصری مناظر سے
کہ عام بچوں سے لیتا تھا میں زیادہ اثر
کسی سمے مری طفلی رہی نہ بے پروا
نہ چھو سکی مری طفلی کو غفلتِ طفلی

یہ کھیل کود کے لمحوں میں ہوتا تھا احساس
دعائیں دیتا ہو جیسے مجھے سکوتِ دوام
کہ جیسے ہاتھ ابد رکھ دے دوشِ طفلی پر
ہر ایک لمحہ کے رخنوں سے جھانکتی صدیاں
کہانیاں جو سنوں ان میں ڈوب جاتا تھا
کہ آدمی کے لئے آدمی کی جگ بیتی
سے بڑھ کے کون سی شے اور ہو ہی سکتی ہے

انہی فسانوں میں پنہاں تھے زندگی کے رموز

انہی فسانوں میں کھلتے تھے رازہائے حیات

انہی فسانوں میں ملتی تھیں زیست کی قدریں

رموزِ بیش بہا ٹھیٹھ آدمیت کے

کہانیاں تھیں کہ صد درس گاہِ رقّتِ قلب

ہر اک کہانی میں شائستگیِ غم کا سبق

وہ عنصرِ آنسوؤں کا داستانِ انساں میں

وہ نل دمن کی کتھا، سرگزشت ساوتری

شکنتلا کی کہانی، بھرت[1] کی قربانی

وہ مرگ بھیشم تپامہ، وہ سیج تیروں کی

وہ پانچوں پانڈوں کی سرگ یاترا کی کتھا

وطن سے رخصتِ سدھارتھ، رام کا بن باس

وفا کے بعد بھی سیتا کی وہ جلاوطنی

[1] یہاں بھرت سے مراد رام کے بھائی سے ہے۔

وہ راتوں رات سری کرشن کو اٹھائے ہوئے

بلا کی قید سے بسدیو کا نکل جانا

وہ اندھ کار وہ بارش، بڑھی ہوئی جمنا

غم آفریں کہانی وہ ہیر رانجھا کی

شعورِ ہند کے بچپن کی یادگار عظیم

کہ ایسے ویسے تخیل کی سانس اکھڑ جائے

کئی محیر ادراک دیو مالائیں

ہت اوپدیش کے قصے کتھا، سرت ساگر

کروڑوں سینوں میں وہ گونجتا ہوا آلھا

میں پوچھتا ہوں کسی اور ملک والوں سے

کہانیوں کی یہ دولت، یہ بے بہا دولت

فسانے دیکھ لو ان کے، نظر بھی آتی ہے

میں پوچھتا ہوں کہ گہوارے اور قوموں کے

بسے ہوئے ہیں کہیں ایسی داستانوں سے؟

کہانیاں جو میں سنتا تھا اپنے بچپن میں

مرے لئے وہ نہ تھیں محض باعثِ تفریح

فسانوں سے مرے بچپن نے سوچنا سیکھا

فسانوں سے مجھے سنجیدگی کے درس ملے

فسانوں میں نظر آتی تھی مجھ کو یہ دنیا

غم و خوشی میں رچی پیار میں بسائی ہوئی

فسانوں سے مرے دل نے گھلاوٹیں پائیں

یہی نہیں کہ مشاہیر ہی کے افسانے

ذرا سی عمر میں کرتے ہوں مجھ کو متاثر

محلے ٹولے کے گمنام آدمیوں کے

کچھ ایسے سننے میں آتے تھے واقعاتِ حیات

جو یوں تو ہوتے تھے "فرسودہ اور معمولی"

مگر تھے آئینے اخلاص اور شرافت کے

یہ چند آئی گئی باتیں ایسی باتیں تھیں

کہ جن کی اوٹ چمکتا تھا دردِ انسانی

یہ واردات نہیں رزمیۂ حیات کے تھے

غرض کہ یہ ہیں مرے بچپنے کی تصویریں

ندیم اور بھی کچھ خط و خال ہیں ان کے

یہ میری ماں کا ہے کہنا کہ جب میں بچّہ تھا

میں ایسے آدمی کی گود میں نہ جاتا تھا

جو بدقوارہ ہو، عیبی ہو یا ہو بدصورت!

مجھے بھی یاد ہے نو دس برس ہی کا میں تھا

تو مجھ پہ کرتا تھا جادو سا حسنِ انسانی

کچھ ایسا ہوتا تھا محسوس جب میں دیکھتا تھا

شگفتہ رنگ، تر و تازہ روپ والوں کا

کہ ان کی آنچ مری ہڈیاں گلا دے گی

اک آزمائش جاں تھی کہ تھا شعورِ جمال

اور اس کی نشتریت اس کی استخواں سوزی

غم و نشاط ، لگاوٹ ، محبت و نفرت

اک انتشار ، سکوں ، اضطراب ، پیار ، عتاب

وہ بے پناہ ذکی الحسی وہ حلم و غرور

کبھی کبھی وہ بھرے گھر میں حسِ تنہائی

وہ وحشتیں مری ماحولِ خوشگوار میں بھی

مری سرشت میں ضدین کے کئی جوڑے

شروع ہی سے تھے موجود آب و تاب کیساتھ

مرے مزاج میں پنہاں تھی ایک جدلیت

رگوں میں چھوٹتے رہتے تھے بے شمار انار

ندیم یہ ہیں مرے بال پن کے کچھ آثار

وفور و شدتِ جذبات کا یہ عالم تھا

کہ کوندے جست کریں دل کے آبگینے میں

وہ بچپنا جسے برداشت اپنی مشکل ہو

وہ بچپنا جو خود اپنے پہ تیوریاں سی چڑھائے

ندیم ذکر جوانی سے کانپ جاتا ہوں
جوانی آئی دبے پاؤں اور یوں آئی
کہ اس کے آتے ہی بگڑا بنا بنایا کھیل
وہ خواہشات کے جذبات کے اُڈتے ہوئے
وہ ہونکتے ہوئے بے نام آگ کے طوفاں
وہ پھوٹتا ہوا چوالا مکھی جوانی کا
رگوں میں اٹھتی ہوئی آندھیوں کے وہ جھٹکے
کہ جو توازن ہستی جھنجھوڑ کے رکھ دیں
وہ زلزلے کہ پہاڑوں کے پیر اُکھڑ جائیں
بلوغت کی وہ ٹیسیں وہ کرب نشوونما
اور ایسے میں مجھے بیاہا گیا بھلا کس سے
جو ہو نہ سکتی تھی ہرگز مری شریک حیات
ہم ایک دوسرے کے واسطے بنے ہی نہ تھے
سیاہ ہوگئی دنیا مری نگاہوں میں

وہ جس کو کہتے ہیں شادیِ خانہ آبادی
مرے لئے ہوئی شادیِ خانہ بربادی
مرے لئے وہ بنی بیوگی جوانی کی
لٹا سہاگ مری زندگی کا مانڈو میں
ندیم کھا گئی مجھ کو نظر جوانی کی
بلائے جان مجھے ہو گیا شعورِ جمال
تلاشِ شعلۂ الفت سے یہ ہوا حاصل
کہ نفرتوں کا اگن کنڈ بن گئی ہستی
وہ حلق و سینہ و رگ رگ میں بے پناہ چھپا
ندیم جیسے نگل لی ہو میں نے ناگ پھنی
زعشق زادم و عشقم بکشت زار و دریغ
خبر نہ برد بہ رستم کسے کہ سہرابم
نہ پوچھ عالم کام و دہن ندیم مرے
ثمرِ حیات کا جب راکھ بن گیا منہ میں

یہ چلتی پھرتی چتا بن گیا جوانی کی

میں کاندھا دیتا رہا اپنے جیتے مردے کو

یہ سوچتا تھا کہ اب کیا کروں کہاں جاؤں

بہت سے اور مصائب بھی مجھ پہ ٹوٹ پڑے[1]

میں ڈھونڈھنے لگا ہر سمت سچی جھوٹی پناہ

تلاشِ حسن میں، شعروادب میں، دوستی میں

زندھی صدا سے محبت کی بھیک مانگی ہے

نئے سرے سے سمجھنا پڑا ہے دنیا کو

بڑے جتن سے سنبھالا ہی خود کو میں نے ندیم

مجھے سنبھلنے میں چالیس سال گزرے ہیں

مری حیات تو وشِ پان[2] کی کتھا ہے ندیم

میں زہر پی کے زمانے کو دے سکا امرت

[1] والد بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی موتوں کی طرف اشارہ ہے۔ فراق

[2] مہادیو کے زہر پینے کی کتھا فراق

نہ پوچھ میں نے جو زہرابۂ حیات پیا
کوئی اتارے اس کو تو ہڈیاں اڑ جائیں
مگر ہوں دل سے میں اس کے لئے سپاس گزار
لرزتے ہاتھوں سے دامن خلوص کا نہ چھٹا
بچاکے رکھی تھی میں نے امانتِ طفلی
اسے نہ چھین سکی مجھ سے دستبردِ شباب
بقول شاعرِ ملکِ فرنگ ہر بچہ
خود اپنے عہد جوانی کا باپ ہوتا ہے
یہ کم نہیں ہے کہ طفلئ رفتہ چھوڑ گئی
دلِ حزیں میں کئی چھوٹے چھوٹے نقش قدم
مری انا کی رگوں میں پڑے ہوئے ہیں ابھی
نہ جانے کتنے بہت نرم انگلیوں کے نشاں
ہنوز وقت کے بے درد ہاتھ کر نہ سکے
حیاتِ رفتہ کی زندہ نشانیوں کو فنا

زمانہ چھین سکے گا نہ میری فطرت سے

مری صفا مرے تحت الشعور کی عصمت

تخیّلات کی دوشیزگی ردِ عمل

جوان ہو کے بھی بے لوث طفل وش جذبات

سیانا ہونے پہ بھی یہ جبلتیں میری

یہ سرخوشی و غم بے ریا، یہ قلبِ گداز

بغیر بیر کے ان بن، غرض سے پاک تپاک

غرض سے پاک یہ آنسو، غرض سے پاک ہنسی

یہ دشتِ دہر میں ہمدردیوں کا سرچشمہ

قبولیت کا یہ جذبہ، یہ کائنات و حیات

اس ارضِ پاک پر ایمان، یہ ہم آہنگی

ہر آدمی سے ہر اک خوب و زشت سے یہ لگاؤ

یہ ماں کی گود کا احساس سب مناظر میں

قریب و دور زمیں میں یہ بوئے وطنیت

نظامِ شمس و قمر میں پیامِ حفظِ حیات
بچشمِ شام و سحر مامتا کی شبنم سی
یہ سازِ دل میں مرے نغمۂ انا الکونین

ہر اضطراب میں روحِ سکونِ بے پایاں
زمانۂ گزراں میں دوام کا سرگم
یہ بزمِ جشنِ حیات و ممات سجتی ہوئی
کسی کی یاد کی شہنائیاں سی بجتی ہوئی

یہ رمزیت کے عناصر، شعورِ پختہ میں
فلک پہ وجد میں لاتی ہے جو فرشتوں کو

وہ شاعری بھی بلوغِ مزاجِ طفلی ہے
یہ نشتریتِ ہستی یہ اس کی شعریت
یہ پتی پتی پہ گلزارِ زندگی کے کسی
لطیف نور کی پرچھائیاں سی پڑتی ہوئی
بہم یہ حیرت و مانوسیت کی سرگوشی

بشر کی ذات کہ مہرِ الوہیّت بہ جبیں

ابد کے دل میں جڑیں مارتا ہوا سبزہ
غمِ جہاں مجھے آنکھیں دکھا نہیں سکتا

کہ آنکھیں دیکھے ہوئے ہوں میں اپنے بچپن کی

مرے لہو میں ابھی تک سنائی دیتی ہیں
سکوتِ حزن میں بھی گھنگھروں کی جھنکاریں

یہ اور بات کہ میں اس پہ کان دے نہ سکوں

اسی ودیعتِ طفلی کا اب سہارا ہے
یہی ہیں مرہم کافورِ دل کے زخموں پر

انہی کو رکھنا ہے محفوظ تا دمِ آخر

زمین ہند ہے گہوارہ آج بھی ہمدم
اگر حساب کریں دس کروڑ بچوّں کا

یہ بچے ہند کی سب سے بڑی امانت ہیں
ہر ایک بچے میں ہیں صد جہانِ امکانات

مگر وطن کا حل و عقد جن کے ہاتھ میں ہے

نظامِ زندگیٔ ہند جن کے بس میں ہے

روّیہ دیکھ کے اُن کا یہ کہنا پڑتا ہے

کسے پڑی ہے کہ سمجھے وہ اس امانت کو

کسے پڑی ہے کہ بچوں کی زندگی کو بچائے

خراب ہونے سے مٹنے سے سوکھ جانے سے

بچائے کون ان آزردہ ہو نہاروں کو؟

وہ زندگی جسے یہ دے رہے ہیں بھارت کو

کروڑوں بچوں کے مٹنے کا اک المیہ ہے

چرائے جاتے ہیں بچے ابھی گھروں سے یہاں

کہ جسم توڑ دیئے جائیں ان کے تا کہ ملے

چرانے والوں کو خیرات ماگھ میلے کی

جو اس عذاب سے بچ جائیں تو گلے پڑ جائیں

وہ لعنتیں کہ ہمارے کروڑوں بچوں کی

ندیم خیر سے مٹی خراب ہو جائے
وہ مفلسی کہ خوشی چھین لے وہ بے برگی
اُداسیوں سے بھری زندگی کی بے رنگی
وہ یاسیات نہ جس کو چھوئے شعاع اُمید
وہ آنکھیں دیکھتی ہیں ہر طرف جو بے نوری
وہ ٹکٹکی کہ جو پتھرا کے رہ گئی ہو ندیم
وہ بے دلی کہ ہنسی چھین لے جو ہونٹوں سے
وہ دُکھ کہ جس سے ستاروں کی آنکھ بھر آئے
وہ گندگی وہ کثافت مرض زدہ پیکر
وہ بچّے چھن گئے ہوں جن سے بچپنے اُن کے
ہمیں نے گھونٹ دیا جن کے بچپنے کا گلا
جو کھاتے پیتے گھروں کے ہیں بچے ان کو بھی کیا
سماج پھولنے پھلنے کے دے سکی سادھن
وہ سانس لیتے ہیں تہذیب کش فضاؤں میں

ہم اُن کو دیتے ہیں بے جان اور غلط تعلیم
ملے گا علم جہالت نما سے کیا ان کو
نکل کے مدرسوں اور یونیورسٹیوں سے
یہ بد نصیب نہ گھر کے نہ گھاٹ کے ہونگے
میں پوچھتا ہوں یہ تعلیم ہے کہ مکّاری
کروڑوں زندگیوں سے یہ بے پناہ دغا
نصاب ایسا کہ محنت کریں اگر اس پر
بجائے علم جہالت کا اکتساب کریں
یہ الٹا درس ادب یہ سڑی ہوئی تعلیم
دماغ کی ہو غذا یا غذائے جسمانی
ہر اک طرح کی غذا میں یہاں ملاوٹ ہے
وہ جس کو بچوں کی تعلیم کہہ کے دیتے ہیں
وہ درس الٹی چھری ہے گلے پہ بچپن کے
زمین ہند ہنڈولہ نہیں ہے بچوّں کا

کروڑوں بچوں کا یہ دیس اب جنازہ ہے

ہم انقلاب کے خطروں سے خوب واقف ہیں
کچھ اور روز یہی رہ گئے جو بیل د ہنہار
تو مول لینا پڑے گا ہمیں یہ خطرہ بھی
کہ بچے قوم کی سب سے بڑی امانت ہیں

رُباعیات

ہر جلوے سے اک درس نمو لیتا ہوں
لبریز کئی جام و سبو لیتا ہوں
پڑتی ہے جب آنکھ تجھ پر اے جانِ بہار
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

ڈھلکا آنچل دمکتے سینے پہ الک
پلکوں کی اوٹ مسکراہٹ کی جھلک
وہ ماتھے کی کہکشاں وہ موتی بھری مانگ
وہ گود میں چاند سا ہمکتا بالک

آنگن میں لئے چاند کے ٹکڑے کو کھڑی
ہاتھوں پہ جھلاتی ہے اسے گود بھری
رہ رہ کے ہوا میں جو لوکا دیتی ہے
گونج اٹھتی ہے کھلکھلاتے بچے کی ہنسی

نہلا کے چھلکے چھلکے نرمل جل سے
الجھے ہوئے گیسوؤں میں کنگھی کر کے
کس پیار سے دیکھتا ہے بچہ منھ کو
جب گھٹنوں میں لیکے ہے پنھاتی کپڑے

دیوالی کی شام گھر پتے اور سجے
چینی کے کھلونے جگمگاتے لائے
وہ روپ وتی، مکھڑے پر اک نرم دمک
بچے کے گھروندے میں جلاتی ہے دیے

گل ہیں کہ رُخِ گرم کے ہیں انگارے
بالک کے نین سے ٹوٹتے ہیں تارے
رحمت کا فرشتہ بن کے دیتی ہے سزا
ماں ہی کو پکارے اور ماں ہی مارے

مائیں بچوں کو نہلا دھلا کے کپڑے پنھاتے وقت انھیں کھڑا کر کے ان کی کمر گھٹنوں میں مضبوط نرمی سے دبا لیتی ہیں کہ کھلکھلا چنچل بچے بھاگ نہ جائیں ۔

کس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری
ہلتی ہے سڈول باہنہ گوری گوری
ماتھے پہ سہاگ، آنکھوں میں رس، ہاتھوں میں
بچے کے ہنڈولے کی چمکتی ڈوری

آنگن میں ٹھنک رہا ہے ضدیایا ہے
بالک تو ہئی چاند پہ للچایا ہے
درپن اُسے دیکے کہہ رہی ہے یہ ماں
دیکھ آئینے میں چاند اُتر آیا ہے

کس پیار سے ہوتی ہے خفا بچّے سے
کچھ تیوری چڑھائے ہوئے منہ پھیرے ہوئے
اس روٹھنے پر پریم کا سنسار نثار
کہتی ہے کہ جا تجھ سے نہیں بولیں گے

رکشا بندھن کی صبح رس کی پتلی
چھائی ہے گھٹا گگن پہ ہلکی ہلکی
بجلی کی طرح پچک رہے ہیں لچھے
بھائی کے ہے باندھتی چمکتی راکھی

دوشیزہ فضا میں لہلہایا ہوا روپ
آئینۂ صبح میں جھلکتا ہوا روپ
یہ نرم نکھار، یہ سجل دھج، یہ سگندھ
رس میں ہے کنوارے پن کے ڈوبا ہوا روپ

منڈپ کے تلے کھڑی ہے رس کی پتلی
جیون ساتھی سے پریم کی گانٹھ بندھی
مہکے[1] شعلوں کے گرد بھاونر کے سمے
مکھڑے پہ نرم چھوٹ سی پڑتی ہوئی

[1] آگ کو گواہ بنا کر جب دولھا دلھن سات بار جگمگاتے شعلوں کے گرد طواف یا بھاونر کرلیتے ہیں تب بیاہ کی قانونی شکل ہوجاتی ہے۔

آنکھوں میں سرشک جگمگاتا مکھڑا
وہ جشنِ رخصتی سہانا تڑکا
جھرمٹ میں سہیلیوں کے اُٹھتے ہیں قدم
وہ گھر کی عورتوں کا بابُل گانا

تکیوں کے آس پاس الکوں کی لٹک
آنچل کے تلے پھولوں کے جلتے دیپک
وہ سیج پہ جگمگاتی کرنوں کی چھوٹ
وہ ماتھے پر سہاگ تارےؔ کی جھمک

یہ راز و نیاز اور یہ سمے خلوت کا
یہ آنکھ میں آنکھ ڈال دینا تیرا
ہرنی ہے ڈری ڈری سی اور کچھ مانوس
یہ نرم جھجک سپردگی کی یہ ادا

لہ سہاگ تارا یعنی سہاگ کی بیندی

جب رات گئے سہاگ کرتی ہے نگاہ
دل میں شب ماہ کے اُترتی ہے نگاہ
رتنار نین سے پھوٹتی ہیں کرنیں
یا کاہکشاں کی مانگ بھرتی ہے نگاہ

ہے بیاہتا پر روپ ابھی کنوارا ہے
ماں ہے پر ادا جو بھی ہے دوشیزا ہے
وہ مود بھری، مانگ بھری، گود بھری
کنیا ہے سہاگن ہے جگت ماتا ہے

یہ ہلکے سلونے سانولے پن کا سماں
جمنا جل میں اور آسمانوں میں کہاں
سیتا پہ سوئمبر میں پڑا رام کا عکس
یا چاند سے مکھڑے پہ ہے زلفوں کا دھواں

مدھوبن کے بسنت سا سجیلا ہے وہ روپ
برکھا رُت کی طرح رسیلا ہے وہ روپ
رادھا کی جھپک کرشن کی برزوری ہے
گوکل نگری کی راس لیلا ہے وہ روپ

تو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لے لیتی ہے
دکھ درد زمانے کے مٹا دیتی ہے
سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں
سکھ شانت کی گویا تو ہری کھیتی ہے

لچکا لچکا بدن مجسّم ہے نسیم
مہکا مہکا وہ چہرہ سانسوں کی شمیم
دوشیزگیٔ جمال صبحِ جنّت
گاتے ہوئے نرم گام موجِ تسنیم

پچیلا گات اور اوستھا[1] ہے کشور[2]
وہ چال کہ جیسے مل کے ناچیں سو مور
کوک اٹھتی ہیں کوئلیں وہ کالی زلفیں
منھ تکتا ہے چندرماں کے دھوکے میں چکور

چھڑکاؤ ہوئے چبوترے پر کچھ نم
بیٹھی ہے سہاگنی، بدن میں کچھ خم
چٹکی سے شعاعِ نور برساتی ہوئی
ہے دیدنی چوک پورنے کا عالم

ہے مانند فلک پر کہکشاں کا بھی نکھار
یوں پور رہی ہے چوک وہ کر کے سنگار
بل کھائی لکیریں ہیں کہ چلتا جادو
بڑھتی ہوئی چٹکیوں کی جنبش کے نثار

[1] اوستھا ۔ سن ۔ عمر [2] کشور ۔ نورس ۔ نوخیز

چولہے کی سہانی آنچ، مکھڑا روشن
ہے گھر کی لکشمی پکاتی بھوجن
دیتے ہیں کرچھلی کے چلنے کا پتہ
سیتا کی رسوئی کے کھنکتے برتن

کس درجہ سکوں نما ہیں ابرو کے ہلال
خیر و برکت کے دھن لٹاتی ہوئی چال
جیون ساتھی کے آگے دیوی بن کر
آتی ہے سہاگنی سجائے ہوئے تھال

پریمی کے ساتھ کھانے کا وہ عالم
پھلکے پہ وہ ہاتھ جسم نازک میں وہ خم
لقمے کے اٹھانے میں کلائی کی لچک
دلکش کتنا ہے منہ کا چلنا کم کم

جب جھولا جھولنے میں ساون وہ گائے
کروٹ قوس قزح کو رہ رہ کے دلائے
وہ پینگ بڑھانے میں لچکتا ہوا جسم
آئینہ نیلگوں میں بجلی لہرائے

اودی اودی گگن پہ چھائی ہے گھٹا
ساجن کے بیوگ میں سُتا سا مکھڑا
اب سوچ سنگارکی کہ آتے ہیں پیا
پڑنے لگی رس کی بوند کا گا بُولا

ہودی پہ کھڑی، کھلا رہی ہے چارا
جوبن رس انکھڑیوں سے چھلکا چھلکا
کومل ہاتھوں سے ہے، تھپکتی گردن
کس پیار سے گائے دیکھتی ہے مکھڑا

وہ گائے کو دوہنا سہانی صبحیں
گرتی ہیں بھرے تھن سے چمکتی دھاریں
گھٹنوں پہ کلس کا وہ کھنکنا کم کم
یا چٹکیوں سے پھوٹ رہی ہیں کرنیں

متھتی ہے جسے دہی کو رس کی پتلی
الکوں کی لٹیں کچوں پہ لٹکی لٹکی
وہ چلتی ہوئی سڈول باہوں کی لچک
کومل مکھڑے پر اک سہانی سرخی

آنکھیں ہیں کہ پیغام محبت والے
بکھری ہیں لٹیں کہ نیندیں ہیں کالے
پہلو سے لگا ہوا ہرن کا بچہ
کس پیار سے ہے بغل میں گردن ڈالے

کروٹ سے سو رہی ہے کھولے گیسو
پو پھٹتی ہے یا جھلک رہا ہے پہلو
پل کر مانوس ہوگیا ہے کتنا
تلوؤں سے کل رہا ہے آنکھیں آہو

حمّام میں عریانیٔ تن کا عالم
پیکر کا دھندلکے میں جھلکنا کم کم
اک ہلکی تھرتھری سی سر سے پا تک
شبنم سے دھلی شفق بھی کھاتی ہے قسم

نرمل جل سے نہا کے رس کی پتلی
بالوں سے ارگجے کی خوشبو لپٹی
ست رنگ دھنش کی طرح باہوں کو اٹھائے
پھیلاتی ہے الگنی پہ گیلی ساڑی

نکھری نکھری نئی جوانی دمِ صبح
آنکھیں ہیں شگنوں کی کہانی دمِ صبح
آنگن میں سہاگنی اٹھائے ہوئے ہاتھ
تلسی پہ چڑھا رہی ہے پانی دمِ صبح

آنگن میں سہاگنی نہا کے بیٹھی
رامائن زانوؤں پہ رکھی ہے کھُلی
جاڑے کی سُہانی دھوپ کھُلے گیسو کی
پرچھائیں چمکتے صفحے پر پڑتی ہوئی

معصوم جبیں میں خیر و برکت کی سحر
وہ صبح کے تارے کی طرح نرم نظر
وہ چہرہ کہ جیسے سانس لیتا ہو گلاب
وہ لب کہ طمانیت کی آبھا[1] جن پر

[1] آبھا : نہایت نرم روشنی

امرت وہ ہلاہل کو بنا دیتی ہے
غصّے کی نظر پھول کھِلا دیتی ہے
ماں لاڈلی اولاد کو جیسے تاڑے
کِس پیار سے پریمی کو سزا دیتی ہے

پیاری تری چھب دِل کو لُبھا لیتی ہے
اس روپ سے دُنیا کی ہری کھیتی ہے
ٹھنڈی ہے چاند کی کرن سی لیکن
یہ نرم نظر آگ لگا دیتی ہے

زُلفِ پُرخم عنانِ شب موڑتی ہے
آوازِ طلسمِ تیرگی توڑتی ہے
یوں جلوؤں سے تیرے جگمگاتی ہے زمیں
ناگن جس طرح کینچلی چھوڑتی ہے

وہ کالی رات کی کمندیں ٹوٹیں
رنگیں شعاعیں تیر بن کر چھوٹیں
وہ جوڑے گیسوئے پریشاں کے بندھے
وہ نرگسِ سرمگیں سے کرنیں پھوٹیں

اُڑ کر وہ کبوتروں کی ٹکڑی اُتری
وہ روپ کی لکشمی ہے سواگت[1] کو کھڑی
دہکے چہرے پہ پھڑپھڑاتے ہوئے پر
کاندھوں پر، سینہ اور سر پر بیٹھی

آنسو سے بھرے بھرے وہ نینا رس کے
ساجن کب اے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات، یہ برہ کی پیڑا
جس طرح اُلٹ گئی ہو ناگن ڈس[2] کے

[1] سواگت (بروزن ساگت) = خیر مقدم [2] یہ تشبیہ شاعرِ اعظم سورداس سے لی گئی ہے۔

پریمی کو بخار، کھل نہیں سکتی ہے پلک
بیٹھی ہے سرہانے، مانند مکھڑے کی دمک
جلتی ہوئی پیشانی پہ رکھ دیتی ہے ہاتھ
پڑ جاتی ہے بیمار کے دل میں ٹھنڈک

چہرے پہ ہوائیاں نگاہوں میں ہراس
ساجن کے برہ میں روپ کتنا ہے اُداس
مکھڑے پہ دھواں دھواں لٹاؤں کی طرح
بکھرے ہوئے بال ہیں کہ سیتا بن باس

پنگھٹ پہ گگریاں چھلکنے کا یہ رنگ
پانی ہچکولے لیکے بھرتا ہے ترنگ
کاندھوں پہ، سروں پہ دونوں باہوں میں کلس
مدانکھڑیوں میں سینوں میں بھرپور اُمنگ

یہ ایکھ کے کھیتوں کی چمکتی سطحیں
معصوم کنواریوں کی دلکش دوڑیں
کھیتوں کے بیچ میں لگاتی ہیں چھلانگ
ایکھ اتنی اُگے گی، جتنا اونچا کودیں[1]

یہ روپ مدن[2] کے بھی خطا ہوں اَوسان
یہ سج جو توڑ دے رتی[3] کا ابھمان
پھیکی پڑتی ہے دھوپ یہ جوبن جوت
یہ رنگ کہ آنکھ کھول دے جیون گان[4]

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے
دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ سج یہ دھج یہ نرم اُجالا یہ نکھار
بچّہ سوتے میں مسکرائے جیسے

[1] چیت کی چاندنی میں ایکھ کے کھیتوں میں کنواری لڑکیاں چھلانگ لگاتی ہیں عقیدہ ہے کہ جتنی اونچی چھلانگ ہوگی اتنی اونچی ایکھ اُگے گی۔
[2] مدن عشق کا دیوتا [3] رتی۔ مدن کی بیوی۔ [4] جیون گان۔ نغمۂ حیات۔

اُوشا پچھلے کو کُنمنائے جیسے
رس کلیوں کی رگوں میں تھرتھرائے جیسے
یہ پیکرِ نازنیں کا عالم دمِ صبح
انگڑائی سی شفق کو آئے جیسے

جب تاروں نے جگمگاتے ہیرے تولے
جب شبنم نے فلک سے موتی رُولے
کچھ سوچ کے خلوت میں بصد نازاُس نے
نرم انگلیوں سے بند قبا کے کھولے

الہام نما

(رباعیوں میں فکر عالیہ کا اظہار)

اے معنی کائنات مجھ میں آجا
اے رازِ صفات وذات مجھ میں آجا
سوتا سنسار جھلملاتے تارے،
اب بھیگ چلی ہے رات مجھ میں آجا

دن رات شجر حجر کی نبضیں ہیں تپاں
ہر سانس زمیں کی ہے سوزاں سوزاں
مدفون وہاں کون سی چنگاری ہے
اب تک اٹھتا ہے بطنِ گیتی سے دھواں

ہر عیب سے مانا کہ جدا ہو جائے
کیا ہے اگر انسان خدا ہو جائے
شاعر کا تو بس کام یہ ہے، ہر دل میں
کچھ دردِ حیات اور سوا ہو جائے

کچھ نظرئے ہیں ہر تمدن کی بنا
تاریخ، تصادم انھیں آدرشوں کا
تہذیبوں کو اپنے سے ہے خطرہ یعنی
ہے نقصِ فکریات پیغامِ قضا

تاریکی کا رہے زمانہ میں نہ داغ
اس نُورِ حیات کا لگاتے ہیں سراغ
موجِ نفسِ سرد دیئے جاتی ہے لَو
دھارے پہ فنا کے ہم جلاتے ہیں چراغ

کل لندن و نیویارک میں گونجی یہ صدا
معلوم بھی ہے روزِ حساب آپہنچا
کب تک یہ ملوکیّت کے خواب نوشیں
بھاگو بھاگو کہ ایشیا جاگ اُٹھا

لہرایا پسِ افق نشانِ فردا
تاریخ نے چھیڑی داستانِ فردا
چُھپتا جاتا ہے کاروانِ امروز
بڑھتا آتا ہے کاروانِ فردا

دن ڈوب گیا تو بات کچھ اور بھی ہے
آنکھ اوجھل واردات کچھ اور بھی ہے
خاموشی و تیرگی و خنکی کے سوا
اے انجم و ماہ، رات کچھ اور بھی ہے

ہر جسم کو ہم کرتے رہے جان نما
فطرت کو بناتے گئے انسان نما
غدّار عناصر کو کیا ہم نے مطیع
ہوتا گیا قہرمان، رحمان نما

کہہ دو بامِ فلک سے ہو اور بلند
سیاروں کی رفتار بھی ہو جائے دوچند
بے لاگ مہ و مہر کھنچے آتے ہیں
پڑتی ہے کہاں نگاہِ شاعر کی کمند

انسان کو محض کھاتے پیتے گزرے
اِس منزل سے وہ پاؤں آگے نہ دھرے
وحشی کے عمل کی انتہا صید و شکار
گر عشق نہ ہو عمل ترقی نہ کرے

وجدانِ جمال ایک جوہر ہے لطیف
بے اُس کے تو نیکیاں بھی رہتی ہیں کثیف
بے فائدہ شاعری کی زحمت نہ کریں
ہر ایک کے بس کا نہیں یہ فنِ شریف

وہ پھوٹ مذاہبِ جہاں نے ڈالی
اخلاق میں بھی پڑ گئی نفسی نفسی
اخلاق حیاتِ اجتماعی کی ہے دین
ماحول کی میراث نہیں بٹ سکتی

اس نظم[1] کے بچنے کا نہیں کوئی اُپائے
بیٹھے ہیں مگر چارہ گر اک آس لگائے
جیسے مرتے مریض کے سمبندھی
سوچیں کہ عجب کیا یہ کہیں بچ ہی جائے

ان نغموں میں تاثیرِ شفا ہے جو بہم
راز اُس کا تمھیں آج بتاتے ہیں ہم
دل کے سوزِ نہاں میں ہو کر تحلیل
کچھ نشترِ تیز بن گئے ہیں مرہم

شاخوں پہ کنول گل کے جلا دیتی ہیں
سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دیتی ہیں
یہ عالم سوز و سازِ گلزارِ جہاں
شبنم کی لویں آگ لگا دیتی ہیں

[1] نظام ملوکیت

کھوئی ہوئی ہستی کا بہم ہو جانا
آزادِ فریب کیف و کم ہو جانا
تو رازِ حیات پوچھتا ہے مجھ سے
وہ راز ہے شائستۂ غم ہو جانا

صحرا میں زمان مکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراقؔ
تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

کھلتا نہیں یہ بھید ہی کیا، بات ہی کیا
الہام کہیں اس کو کہ سمجھیں اِلقا
ہاں فکرِ سخن کے وقت کانوں میں فراقؔ
اکثر پرِ جبریل کی آئی ہے صدا

ایک دن شاعر حریم قدرت میں گیا
سربستہ مشیتوں کو جانچا، پرکھا
اور اُن میں آخری مشیّت یہ تھی
آدم کا مشیتّوں پہ قابو پانا

قبل اس کے کہ ہو فیصلۂ خیر و شر
جینے کا ثبوت دے زمانے کو بشر
بے حس کردارِ نیک سے موت بھلی
نامرد اخلاق سے جرائم بہتر

گو بزمِ سخن میں آپ لائے تشریف
خوش ہوں گے سُن کے قافیہ اور ردیف
اس کا کیا کیجئے گا اے حاکمِ وقت
احساسِ لطیف سے جو ہو گی تکلیف

الفاظ کے پردوں میں کرو اس کا یقیں
لیتی ہے سانس نظمِ شاعر کی زمیں
آہستہ ہی گنگناؤ میرے اشعار
ڈر ہے نہ مرے خواب کچل جائیں کہیں

عورت روح و روانِ تہذیبِ بشر
ہے پرتوِ رُخ جلوہ دہِ قلب و جگر
عورت وہ عروسِ ازلی ہے کہ فراق
ہم کو لئے جاتی ہے جو "آگے" "اوپر"

اِک راز سے کر رہا ہوں تجھ کو آگاہ
ممنوع و حرام کچھ نہیں ہے واللہ
جس کام میں محویتِ کامل نہ رہے
اے دوست سمجھ لے کہ ہے وہ کام گناہ

پاتے جانا ہے اور نہ کھوتے جانا
ہنستے جانا ہے اور نہ روتے جانا
اوّل اور آخری پیامِ تہذیب
اِنسان کو اِنسان ہے ہوتے جانا

واعظ تری جنت ہے فقط وہم و گماں
ہے روکشِ فردوسِ بریں باغِ جہاں
تو اِس کو فریبِ رنگ و بو کہتا ہے
تنکا بھی ہے اس باغ کا رشکِ رگِ جاں

اے شیخ مآلِ زہد و تقویٰ معلوم
دنیا ہی نہ ہاتھ آئی تو عقبیٰ معلوم
انکار ہے ماسوائے اللہ سے تجھے
خاموش کہ ماسوائے دُنیا معلوم

اک حلقۂ نور تھا ابد کا منظر
آویزاں تھے بے شمار خورشید و قمر
تا حدِّ نظر سلسلۂ موجودات
ہر شے سے اُبھر رہی تھی تقدیرِ بشر

تو بزمِ سخن میں نغمہ خواں ہوتا ہے
مُطرب مجھے کچھ اور گماں ہوتا ہے
نغماتِ خوش آہنگ کے ہر پردے میں
اک سازِ سکوتِ بیکراں ہوتا ہے

شاعر کے تصوّرات ہیں کتنے حسیں
اک عالمِ رنگ و نور رقصاں ہے کہیں
جیسے دمِ صبح لہلہاتی کرنیں
جب چوم رہی ہوں وہ ہمالہ کی جبیں

ہنگامۂ روزگار دم لیتے ہیں
سنسار کا ہم بھید بھرم لیتے ہیں
یہ لمحے وہ ہیں جب دلِ شاعر میں فراقؔ
کچھ رمز و کنایات جنم لیتے ہیں

بے وجہ نہیں ہے مری افسردہ دمی
دنیا میں نہیں چاشنیِ غم کی کمی
سنسار کی جس چیز کو چھو دیتا ہوں
ملتی ہے فراقؔ اس میں اشکوں کی نمی

ہر ساز سے ہوتی نہیں یہ دُھن پیدا
ہوتا ہے بڑے جتن سے یہ گن پیدا
میزانِ نشاط و غم میں صدیوں تُل کر
ہوتا ہے حیات میں توازن پیدا

غیرت کو سست اَساس کر دیتا ہے
احسان بھی بدحواس کر دیتا ہے
انسان کا جذبۂ تشکّر ہمدم
اکثر مجھ کو اُداس کر دیتا ہے

تنہائی میں ہم کسے بلائیں اے دوست
تم دُور ہو کس کے پاس جائیں اے دوست
اس دولتِ وقت سے تو دم گھُٹتا ہے
یہ نقدِ شب کہاں لُٹائیں اے دوست

کل رات گئے فکرِ سخن کے ہنگام
وجدانِ جمال کے چھلکتے ہوئے جام
وہ کشف و کرامات کا عالم کہ فراق
ہر پل پہ پڑ رہے تھے صد عکسِ دوام

ہر چیز یہاں اپنی حدیں توڑتی ہے
ہر لمحے پہ صد عکسِ بقا چھوڑتی ہے
اک سبزۂ پامال کی پتی بھی
ہر دم قلب ابد میں جڑ چھوڑتی ہے

آئے دمِ صبح، رسمساؤ اے دوست
جب دن ڈوبے تو گھر نہ جاؤ اے دوست
دن بھر تو رہے ہو پھول بن کر پاس
اب بن کے چراغ جگمگاؤ اے دوست

جاگ اٹھے گی روح تم تو سو جاؤ گے
سرچشمۂ زندگی میں دھو جاؤ گے
کھو جاؤ گے جب مناظرِ فطرت میں
اپنے سے بہت قریب ہو جاؤ گے

یہ بزمِ خیال! چوڑیاں بجتی ہیں
بھیگی راتیں اُداسیاں تجتی ہیں
دریا مکھڑوں کے اُمڈے آتے ہیں فراقؔ
آئینۂ دل میں صورتیں سجتی ہیں

من موہ لے سو رنگ سے رہتی دنیا
یہ وہم حسیں یہ خوبصورت دہوکا
اس دکھ بھری دنیا کا مگر اصلی رُوپ
جب آنکھ کھلی فراقؔ دیکھا نہ گیا

اک حلقۂ زنجیر تو زنجیر نہیں
اک حلقۂ تصویر تو تصویر نہیں
تقدیر تو قوموں کی ہوا کرتی ہے
اک شخص کی قسمت کوئی تقدیر نہیں۔

ہیں ایک بیوگنی برہ سے بیکل
ہریالی پہ چل رہی ہوں آنکھیں ہیں سجل
یہ تاروں بھری رات کھنک جاتی ہے
شبنم، پاؤں کی بن گئی ہے چھاگل

ہر شے پہ تیرگی کی وہ چھاؤں گھنی
میخانۂ شب میں نوش و پیمانہ زنی
چھلکی چھلکی صبوحی موجِ نسیم
فطرت کی وہ پچھلی رات اعضا شکنی

نشترِ سخن

(جو غزلیں گلِ نغمہ میں شامل نہیں ہو سکیں ان کے منتخب اشعار)

دکھاتے ہیں ستارے ایک بہتر زندگی کے خواب
نہ دیکھ ان کی طرف وہ چھین لیں گے سب خوشی تیری

شریکِ بزم ہو کر یوں اُچٹ کے بیٹھنا تیرا
کھٹکتی ہے تری موجودگی میں بھی کمی تیری

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

میں آسمانِ محبت سے رخصتِ شب ہوں
ترا خیال کوئی ڈوبتا ستارا ہے

خلدِ بریں میں آج تک گونج رہی ہے یہ صدا
آؤ عذاب ہی سہیں کیا ہے دھرا نجات میں

جور و کرم، وفا جفا، یاس و اُمید، قرب و بُعد
عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں

نہ حیرت کر ترے آگے جو ہم کچھ چپ سے رہتے ہیں

ہمارے درمیاں اے دوست لاکھوں خواب حائل ہیں

اس دشت بیکسی میں سرِ شام تم کہاں
کچھ چونک سی اٹھی ہیں فضا کی اُداسیاں

آسمانوں کو نیند آتی ہے
کون یہ لے رہا ہے انگڑائی

ریاضِ دہر میں جھوٹی ہنسی ہم نے بھی دیکھی ہے

گلستاں در بغل ہر غنچۂ خنداں نہیں ہوتا

فراق اک اک سے بڑھ کر چارہ سازِ درد ہیں لیکن

یہ دنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

اتفاقات ہیں زمانے کے
اب نہ تم وہ رہے نہ ہم وہ رہے

کتنی آہستہ اور کتنی تیز
دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ

نہ اپنے آپ بدلی ہے نہ اپنے آپ بدلے گی

یہ دنیا ہے تو دنیا کو بدل دے دیکھتا کیا ہے

رخِ ہستی سے چادر سی مگر سرکا ہی جاتی ہے
بہت آہستہ اٹھتی ہے نگاہِ شاعرِ فطرت

میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئیں
تاریکیاں چمک گئیں آوازِ درد سے

سر میں ہو آنکھ تو صورتگریٔ دہر نہ پوچھ ‏ ‏ ‏ خشت و خاشاک میں چہرے نظر آئے ہیں مجھے

وقت جب آگیا تو جان مری ‏ ‏ ‏ بن کے نکلی ہے زندگی کا غبار

موت کا بھی علاج ہو شاید ‏ ‏ ‏ زندگی کا کوئی علاج نہیں

سما سکا نہ کہیں جب نشاطِ لامحدود ‏ ‏ ‏ تو اُسکو حسن نے دو مٹھیوں میں بند کیا

کھوج کس کی ہے مجھے ہجر اسی کا ہے نام ‏ ‏ ‏ وصل کیا بس اسی اک عقدے کا وا ہو جانا

چھٹے قفس سے تو گھر کا سراغ بھی نہ ملا ‏ ‏ ‏ وہ رنگِ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

اک فسوں سامانِ نگاہِ آشنا کی دیر تھی ‏ ‏ ‏ اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

موت اک گیت رات گاتی تھی ‏ ‏ ‏ زندگی جھوم جھوم جاتی تھی

زندگی کو وفا کی راہوں میں ‏ ‏ ‏ موت خود روشنی دکھاتی تھی

اپنی گرہ میں چند خواب تھے دے گئے دنیا کو ہم اور

اے غمِ دوراں، اے غمِ جاناں، اے غمِ انساں کیا کرتے

میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں یارب موجودات کے آنسو

خاموشیٔ جہاں کو سنا ہے کانوں نے آہ و بُکا کرتے

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے ‏ ‏ ‏ تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایا

غمِ فراق تو اس دن غمِ فراق ہوا   جب ان کو پیار کیا میں نے جن سے پیار نہیں

ابھی جبینِ بشر منتظر سی ہے شاید   کہ آدمی ابھی فطرت کا شاہکار نہیں

ابھی ہر شے سے ہوناہی نمایاں شانِ انسانی   ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہی کمی اپنی

تھی منتظر سی دنیا خاموش تھیں فضائیں   آئی جو یاد تیری چلنے لگیں ہوائیں

دبدھا پیدا کر دے دلوں میں ایمانوں کو دے ٹکرانے

بات وہ کہہ اے عشق کہ سُن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے

کوئی کیفیت ہی نہیں وہ اپنے کو اپنی ضد جو بنا نہ دے

کہ وہ غم بھی کیا جو ہنسا نہ دے وہ خوشی بھی کیا جو رُلا نہ دے

حاصلِ حسن و عشق بس اتنا   آدمی آدمی کو پہنچانے

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بہ قدم

رُکے رُکے سے کچھ آنسو رُکی رُکی سی ہنسی

گُہر کا وہ پنکھڑیوں پر سماں   دیدنی ہے بھیگی مسوں کا دُھواں

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں فراق   بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں

ہر طرف پُر کیف اُداسی آؤ کچھ باتیں کریں   رات جتنی بھی ہو باقی نیند پوری ہو چکی

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست

وہ تیری یاد میں ہو یا تجھے بھلانے میں

معلوم ہے سیرابیِ سرچشمۂ حیواں ~ یس تشنہ لبی تشنہ لبی تشنہ لبی ہے

جاؤ نہ تم اس گمشدگی پر کہ ہمارے ہر خواب سے اک عہد کی بنیاد پڑی ہے

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو ~ تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے

انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری

فریبِ رنگ و بو کھا کر چمن سے ہاتھ دھو بیٹھے

ترے وحشی تو کب کے لے اُڑے ہوتے گلستاں کو

دیکھ آئے آج یادوں کا نگر ~ ہر طرف پرچھائیاں پرچھائیاں

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو ~ وہ درد اٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے ~ آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

زندگی کو بھی منہ دکھانا ہے ~ رو چکے تیرے اشکبار بہت

چپ ہو گئے تیرے رونے والے ~ دُنیا کا خیال آگیا ہے

قلوب نور کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں چراغ تیرے تبسم سے جلتے جاتے ہیں

چھڑ گئی ان آنکھوں کی بات ~~ دنیا میں اب دن ہے کہ رات

کیف بردوش بادلوں کو نہ دیکھ ~~ بیخبر تو کچل نہ جائے کہیں

~~

وہ راتیں اور ہی ہیں جن میں میٹھی نیند آجائے

خوشی اور غم میں سونے کے لئے راتیں نہیں ہوتیں

سمجھ کچھ راز حسن و عشق کے شبہائے ہجراں میں

کہ رونے کے لئے یہ دُکھ بھری راتیں نہیں ہوتیں

~~

مری خامشی، خامشی ہی رہی ~~ تری خامشی داستاں بن گئی

قلب یزداں میں پڑ گئے تھے شگاف ~~ مسکرانا ترا ہے یاد مجھے

~~

ذرہ ذرہ کائنات کا رکھتا ہے اک ربطِ نہاں

اک پھول کو جنبش دو گے تو اک تارا کانپ اٹھے گا

~~

نرغے میں آگیا عشقِ اعظم ~~ ٹوٹ پڑے دنیا کے کمینے

آہ یہ مہربانیاں تیری ~~ نہ گئیں سرگرانیاں تیری

~~

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا

اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

وہ تیری نرم دوشیزہ نگاہیں دل نہیں بھولا

پڑی جب جب نظر تیری نگاہِ اولیں نکلیں

رشک صد لطف و کرم ہے یہ نیا رنگِ ستم

کچھ ہمیں جان سکے تیرا پشیماں ہونا

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی — یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

زندگی کیا ہے اسکو آج اے دوست — سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں

جو داستانِ زبانِ غزل بھی کہہ نہ سکی — نگاہِ ناز سناتی ہے کس فصاحت سے

کیا ہے سیرِ گہِ زندگی میں رخ جس سمت — ترے خیال سے ٹکرا کے رہ گیا ہوں میں

وہ اٹھ بھی چکے کب کے وہ جا بھی چکے کب کے

دل ہے کہ فراق اب تک دامن کو چھڑائے ہے

نہ ذکرِ موجِ فنا کر کہ غم کے بیڑوں کو — گدازِ سینۂ ساحل ڈبو چکا کب کا

شکوہِ کیا ستم کا تو نم دیدہ ہو گئے — تم تو ذرا سی بات میں رنجیدہ ہو گئے

اجلے اجلے سے کفن میں سحرِ ہجر فراقؔ
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

ہاتھوں میں ہے جام مے کہ ساقی
کونین کا دل دھڑک رہا ہے

ایک مدت سے دلِ غمگیں پہ تھا اک بوجھ سا
آج تیری یاد میں روئے تو ہلکے ہو گئے

یوں ہی ہر اک نگاہ ہے اک برقِ بے اماں
دل پر نہ گر پڑیں تری باتوں کی بجلیاں

حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراقؔ
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

خطاب پھر نہ کیا تیری بے نیازی سے
تھکی تھکی سی وہ عرضِ وفا ہے یاد مجھے

تمام خستگی و ماندگی ہے عالمِ ہجر
تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی یہ رات